میری محبتیں

(خاکے،یادیں)

حیدرقریشی

انٹرنیٹ ایڈیشن

میری محبتیں کا ای بک ایڈیشن

میری محبتیں کا پہلا ایڈیشن نایاب پبلی کیشنز خان پور کی جانب سے۱۹۹۵ء میں شائع کیا گیا تھا۔اس کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۹۸ء میں معیار پبلی کیشنز دہلی نے شائع کیا تھا۔میری گیارہ کتابوں کے مجموعہ ’’عمرِ لاحاصل کا حاصل‘‘ میں بھی ’’میری محبتیں‘‘ شامل ہے۔اس کلیات کا پہلا ایڈیشن معیار پبلی کیشنز دہلی نے ۲۰۰۵ء میں شائع کیا تھا۔یہ عوامی ایڈیشن تھا۔پھر۲۰۰۹ء میں ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی نے اس کلیات کا لائبریری ایڈیشن شائع کیا۔۲۰۱۲ء میں اس کلیات کا مزید اضافوں کے ساتھ انٹرنیٹ پر ای بک ایڈیشن شائع کیا گیا۔جواِن لائبریری لنکس پر دستیاب ہے۔

http://haiderqureshi-library.blogspot.de/2012/09/blog-post_15.html

https://docs.google.com/file/d/0B_xQnk75odj9TjNicHdudXBFblU/edit

http://haider-qureshi.blogspot.de/2013/12/blog-post_6582.html

’’عمرِ لاحاصل کا حاصل‘‘ کی گیارہ کتابوں میں شامل رہنے کے ساتھ اب ’’میری محبتیں‘‘ کو الگ سے ای بک کی صورت میں بھی شائع کیا جارہاہے اور یہ کتاب ’’خواب کے اندر خواب‘‘ کے انٹرنیٹ ایڈیشن میں بھی شامل ہے۔

انتساب

دونوں بیٹیوں

رضوانہ اور دُرِ ثمین کے نام

مِری چڑیوں کی جوڑی ہے
اک پہلوٹھی کی
اک پیٹ کھروڑی ہے

فہرست

اول خویش:

بعد درویش:

برگد کا پیڑ

(اباجی)

گلابوں کی مہک تھی یا کسی کی یاد کی خوشبو
ابھی تک روح میں مہکار کا احساس باقی ہے

باپ بیٹے کے مابین اوّلین تعارف کا کوئی واقعہ بیان کرنا اس لحاظ سے بے معنی سی بات ہے کہ یہ تعارف تو خون کے اجزا میں سے ڈھونڈ نکالنا بھی مشکل ہے۔ صدیوں پہلے ہم اپنے آباؤ اجداد کے لہو میں موجزن تھے۔ اپنی پیدائش سے پہلے میں اباجی کے لہو میں رواں تھا تو اباجی اپنی وفات کے بعد بھی میرے دل میں دھڑک رہے ہیں۔ اس کے باوجود شعوری سطح پر اباجی سے میرا پہلا معانقہ اس وقت ہوا جب میری عمر تقریباً تین سال تھی۔ یہ واقعہ آج بھی میرے شعور میں ایک ہیُولے کی طرح موجود ہے۔ یوں تو ہر انسان اپنے بچپن میں فطرت سے بہت قریب ہوتا ہے لیکن مجھے بچپن میں فطرت سے کچھ زیادہ ہی پیار تھا۔ چنانچہ جیسے ہی موقعہ ملتا الاسٹک والی نیکر اور پچ بٹنوں والی شرٹ اتار کر فطری لباس پہن لیتا۔ ایسا ایک موقعہ مجھے اُس وقت ملا جب امی جی سامنے والے گھر کی بُوا زیبو کے ہاں گئیں اور میں فطری لباس پہنے گھر سے نکل کھڑا ہوا۔ رحیم یار خاں کے محلّہ قاضیاں سے (موجودہ) جدید بازار تک کئی پیچ دار رستوں سے نجانے میں کس طرح گزرتا چلا گیا۔ اباجی وہاں اپنے ایک دوست ممتاز صاحب کی دوکان پر کھڑے تھے۔ میں جا کر ''ابوا'' کہتے ہوئے ان کی ٹانگوں سے لپٹ گیا۔ انہوں نے سمجھا کسی کا بچہ ہے جو خواہ مخواہ ان سے

چمٹ گیا ہے۔ چنانچہ میرے معانقہ کے جواب میں انہوں نے میری طرف دیکھے بغیر مجھے اپنے سے الگ کر کے پرے کر دیا۔ میں پھر ''ابوا'' کہتے ہوئے ان کی ٹانگوں سے چمٹ گیا۔ اس بار پھر انہوں نے دیکھے بغیر مجھے پرے دھکیل دیا اور میں اپنے حواس درست کئے بغیر تیسری بار پھر ''ابوا'' کہہ کر ان کی ٹانگوں سے معانقہ کرنے لگا۔ لیکن اب اس سے پہلے کہ اباجی مجھے پھر پرے دھکیلتے ممتاز صاحب کی نظر مجھ پر پڑ گئی۔ انہوں نے حیران ہوتے ہوئے اباجی سے کہا: قریشی صاحب! یہ تو حیدر ہے۔ اب جو اَباجی نے پلٹ کر دیکھا تو میری میلی کچیلی، ننگ دھڑنگ حالت ہی میں مجھے اٹھا لیا۔ پھر سب کچھ بھول بھال کر گھر کی طرف چل دیئے۔ راستہ بھر بار بار مجھے خود سے لپٹاتے اور چومتے جاتے۔ گھر پہنچے تو وہاں میری گمشدگی پر کہرام برپا تھا، یہ اباجی سے گویا شعوری سطح پر میرا پہلا تعارف تھا۔

اباجی وضع دار انسان تھے۔ روایات سے محبت رکھتے تھے مگر زمانے کے ارتقا کی سچائی کو مانتے تھے۔ ۱۹۶۰ء تک پھندنے والی رومی ٹوپی پہنتے رہے۔ اس ٹوپی کو ترکی ٹوپی بھی کہتے تھے۔ پھر کلاہ کے ساتھ لنگی باندھنی شروع کی اور جناح کیپ بھی استعمال کرتے رہے۔ آج اباجی کی ساری زندگی کی طرف نظر دوڑاتا ہوں تو مجھے ان کے اندر بیک وقت ایک دراوڑ، ایک آریا اور ایک عرب بیٹھا نظر آتا ہے۔ ان کی زندگی کے ابتدائی ایام میں دراوڑ حاوی رہا۔ عالم شباب میں نواب بھاولپور تک رسائی حاصل کر کے انہیں بھاول نگر محکمہ پولیس میں محرر لگوایا گیا جب سارا سامان باندھ کر روانہ ہونے کا وقت آیا تو داداجی نے دبی زبان سے کہا: بیٹا!۔ تو پھر جا رہے ہو؟۔۔ اچھا جاؤ، ویسے دل نہیں کرتا کہ جاؤ۔

اباجی نے فوراً کہا: دل تو میرا بھی نہیں کرتا کہ جاؤں، اس لئے نہیں جاتا۔۔ یہ کہہ کر بندھا ہوا سامان کھول ڈالا۔

اباجی نے یہ قصہ بڑے مزے لے کر ہمیں سنایا تھا اور پھر کہا تھا: بھئی ہم سرائیکی لوگ تو اپنے شہر کے ریلوے اسٹیشن پر پہنچ کر ہی پردیسی ہو جاتے ہیں۔ یہ واقعہ تقسیم برصغیر سے پہلے کا ہے۔ اگر ان پر ان کے اندر کا دراوڑ حاوی نہ ہوتا تو وہ کم از کم ایس پی کی حیثیت سے ریٹائر ہوتے۔۔ بعد

میں جب خراب حالات بار بار حملہ آور ہونے لگے تو یوں لگا جیسے دراوڑ مغلوب ہو گیا ہے اور اباجی کے اندر کا آریا فاتح ہو گیا ہے۔ رحیم یار خاں والا گھر فروخت کیا گیا تو اباجی کے چہرے پر کوئی کرب نہیں تھا۔ میں تب صرف دس برس کا تھا مگر وہ گھر آج بھی نہ صرف میرے نہاں خانۂ دل میں آباد ہے بلکہ مجھے جب بھی رحیم یار خاں جانے کا موقعہ ملتا ہے، اس گھر کو دیکھنے کے لئے ضرور جاتا ہوں اور وہاں دیر تک بچپن کی یادوں میں گھرا رہتا ہوں۔ خانپور والا گھر فروخت ہوا تو اباجی کے چہرے پر کوئی اداسی نہ تھی۔ یوں ان کے اندر کا آریا فتح یاب ہو گیا۔ مگر دراوڑ مغلوب کہاں ہوا؟ اس نے بیوی بچوں کو دھرتی کا متبادل بنالیا، ایک معمولی سی مدت کے علاوہ بیوی بچوں کو خود سے کبھی جدا نہیں ہونے دیا۔

اندر کے آریا اور دراوڑ کی کشمکش سے بے نیاز ایک عرب درویش ہمیشہ اباجی کے اندر موجود رہا۔ یہ درویش خواب بین، دعا گو اور صاحبِ کشف و کرامت تھا۔ عرب درویش کا کمال یہ تھا کہ نیل آرمسٹرانگ سے دس سال پہلے اس نے چاند کی سرزمین پر قدم رکھ دیا تھا۔ اباجی نے ۱۹۵۹ء میں خواب دیکھا کہ وہ چاند کی سرزمین پر اترے ہوئے ہیں۔ وہاں کے پہاڑ دیکھنے میں ایسے لگتے ہیں جیسے راکھ کے ہوں اور پاؤں رکھتے ہی راکھ میں دھنس جائیں گے۔ لیکن اباجی پہاڑ پر پاؤں رکھتے ہیں تو وہ پتھر کے ہی ہوتے ہیں۔

Rain Makers اور Rain Breakers کے چند قصے تو اب پڑھنے کو ملے ہیں۔ مگر اباجی کی ''وِل پاور'' اور ''ارتکاز'' کا کرشمہ تو ہم نے خود دیکھا تھا۔ اباجی اور امی جی میں ''بزرگی'' کے مسئلہ پر مذاق چلتا رہتا تھا۔ اباجی نے کہا: اگر میں اللہ میاں سے دعا کرکے اسی وقت بارش کروادوں تو میری بزرگی کو مان لوگی؟۔۔ رحیم یار خاں میں گرمیوں کی چلچلاتی دھوپ میں بادلوں کا دور دور تک نشان نہیں تھا۔ اس لئے امی جی نے للکارتے ہوئے شرط منظور کر لی۔ اباجی مکان کی چھت پر چڑھ گئے۔ تقریباً آدھے گھنٹے کے بعد جب چھت سے نیچے آئے، چاروں جانب سے گھنگھور گھٹائیں امڈی چلی آرہی تھیں۔ موسلادھار بارش شروع ہو گئی۔ لیکن امی جی نے اباجی کی بزرگی کو نہیں ماننا تھا نہیں مانیں۔

مریضوں پر دم کرنا اور کسی کی خاص غرض کے لئے خصوصی دعا کرنا ان کی روحانیت یا وِل پاور کا عام سا کرشمہ تھا۔ میری ایک بہن زبیدہ کو جب بھی بخار ہوا اور دوا سے فرق نہیں پڑا، اباجی نے اسے بھینچ کر گلے سے لگایا اور وہ ٹھیک ہو گئی۔ میرے نزدیک ایسے متعدد واقعات کے باوجود اباجی کی سب بڑی کرامت یہ تھی کہ انہوں نے دکھوں سے بھری ہوئی زندگی کو ہنسی خوشی گزار لیا۔ کلاتھ مرچنٹ سے ٹیلر ماسٹر تک کا تکلیف دہ سفر طے کیا۔ پھر شوگر مل میں نوکری کر لی اور مجھے بھی شوگر مل میں جھونک دیا۔ جےَ سنز شوگر ملز خانپور کے جنرل منیجر عزیز حسین کی بیگم بڑی نیک دل خاتون تھیں (اگر ابھی تک زندہ ہیں تو اللہ انہیں مزید زندگی عطا کرے) اباجی کا بے حد احترام کرتی تھیں۔ اپنے بہت سے خانگی معاملات اباجی کو بتا کر ''دعا'' اور ''دوا'' دونوں کے لئے کہتیں۔ بیگم عزیز حسین کی نیکی کے سبب مجھے پندرہ (سولہ) برس کی عمر میں شوگر مل میں مزدوری مل گئی۔ میں نے اپنی زندگی کے بے حد قیمتی انیس سال اس شوگر مل میں برباد کئے۔ بیگم عزیز حسین کی نیک نیتی اور نیکی کے باوجود مجھے شدت سے احساس ہوتا ہے کہ انہوں نے میرے لئے نیکی نہ کی ہوتی تو میں زیادہ بہتر حالت میں ہوتا۔

شوگر مل کی ملازمت کے حوالے سے ہی یاد آیا کہ ملز انتظامیہ کے مزدور دشمن رویے کے باعث مجھے ٹریڈ یونین سرگرمیوں میں حصہ لینا پڑا۔ ملز میں تصادم ہوا۔ بعض اہم افسروں کی ٹھیک ٹھاک پٹائی ہوئی۔ مقدمات بنے۔ اسی دوران مجھے بار بار دھمکیوں کے ساتھ خوشنما آفرز بھی ہوئیں مگر میں جوشِ جوانی اور بغاوت کی دُھن میں ہر آفر کو ٹھکراتا چلا گیا۔ ایک مرحلے پر اباجی سے بھی کہا گیا کہ مجھے مفاہمت کے لئے راضی کریں۔ اباجی نے مجھے بتایا کہ مجھے اس طرح کہا گیا ہے مگر تم جو فیصلہ اپنے طور پر کرنا چاہو، وہی کرو۔ میں نے کہا کہ اگر آپ مفاہمت کا حکم دیتے ہیں تو میں تیار ہوں۔ مگر انہوں نے کہا میں ایسا کوئی حکم نہیں دوں گا۔ تم خود فیصلہ کرو گے اور جو بھی فیصلہ کرو گے وہی درست ہوگا۔ چنانچہ میں نے مفاہمت کی بجائے بغاوت کا فیصلہ کیا۔ اس واقعہ سے میں پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اباجی اپنی وضع داری کی روایت پر تو قائم تھے مگر میرے باغیانہ رویے کو وہ بدلتے ہوئے سیاسی اور سماجی حالات کا لازمی تقاضا سمجھتے تھے۔ اسی لئے مجھے اس

سے روکنے کے بجائے انہوں نے بالواسطہ میری حوصلہ افزائی کی۔ جب ہماری یونین کو معطل کرادیا گیا تب ہم سے ملنے والے ہر مزدور سے باز پرس کی جاتی تھی مگر اباجی کی اپنی شخصیت اتنی مضبوط تھی کہ نہ صرف انہیں ملز انتظامیہ کی طرف سے تنگ نہیں کیا گیا بلکہ ان کا اسی طرح احترام کیا جاتا رہا جیسا میری بغاوت سے پہلے ہوتا تھا۔

اباجی بتاتے تھے کہ ہمارے خاندان میں کئی پشتوں سے بیٹوں کی کمی چلی آ رہی تھی۔ایک بزرگ کے ہاں دو بیٹے ہوئے۔ان بیٹوں میں سے ایک کے ہاں اولاد نہ ہوئی اور دوسرے کے ہاں پھر دو بیٹے ہوئے۔ان میں سے بھی ایک کے ہاں کوئی اولاد نہ ہوئی اور دوسرے کے ہاں پھر دو بیٹے ہوئے۔میاں میر محمد کے ہاں تین بیٹے پیدا ہوئے۔میاں سعید بے اولاد رہے۔میاں غوث محمد کے ہاں ایک بیٹا ہوا مگر اگلے مرحلے میں ان کی نسل بھی ختم ہوگئی۔میاں اللہ رکھا کے ہاں دو بیٹے ہوئے، باباجی اور اباجی۔۔باباجی کے ہاں اولاد نہ ہوئی اور اباجی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔!

اباجی نے دو شادیاں کیں۔پہلی بیوی عزیز بی بی نے اس الزام کی بنیاد پر عدالت کے ذریعے طلاق لی کہ یہ شخص اولاد پیدا کرنے کے قابل نہیں۔پھر اباجی کی شادی ہماری امی جی سے ہوئی اور یکے بعد دیگرے دس بچے پیدا ہوئے۔پانچ بیٹے، پانچ بیٹیاں۔۔عزیز بی بی نے دوسری جگہ شادی کر لی مگر اولاد سے محروم رہی۔

ایک دفعہ بواحیات خاتوں ہماری چھوٹی بہن بے بی کو لے کر ایک رشتہ دار کے یہاں گئیں۔وہیں اباجی کی پہلی بیوی آ گئی۔بے بی کو دیکھتے ہی چونکی۔اس کے استفسار پر بواحیات خاتوں نے بتایا کہ قریشی غلام سرور کی بیٹی ہے۔اسی وقت بے بی کو گود میں لے کر پیار کرنے لگی ۔اباجی کی اولاد کی تفصیل پوچھی۔بواحیات خاتوں نے تفصیل بتادی۔سن کر سارے بچوں کو درازئ عمر کی دعائیں دینے لگی اور پھر حسرت سے کہنے لگی مجھے میری زیادتی کی سزا مل گئی ہے۔۔چند دنوں کے بعد اباجی کی پہلی بیوی کی طرف سے کھانے کی چند اشیاء کا تحفہ ہمارے گھر آیا۔مگر اباجی نے ساری چیزیں تلف کرادیں۔کسی کو چکھنے نہیں دیں ان کا خیال تھا کہ ان اشیاء پر کوئی منفی قسم کا دَم کیا گیا ہے۔۔پہلی بیوی کی بے وفائی کے بعد اباجی کی امی جی سے شادی ہوئی تو دونوں کی عمروں

میں بارہ سال سے زائد کا فرق تھا مگر اس بُعد نے محبت میں اضافہ کیا۔اباجی اور امی جی کی محبت اور خوشگوار ازدواجی زندگی سارے خاندان کے لئے آج بھی ایک مثال ہے۔ایک وقت تھا کہ ہمارے عزیزوں میں اباجی کا گھر سب سے زیادہ خوش حال تھا، پھر وہ وقت آیا کہ اباجی کا گھر انتہائی غربت کا شکار ہوگیا۔بے حد قریب رہنے والے عزیز دور ہوگئے مگر اباجی کے مزاج میں کوئی فرق نہیں آیا۔اباجی بے حد قناعت پسند تھے مگر انہوں نے ہمیں کبھی قناعت کا درس نہیں دیا۔ دراصل وہ اس لئے سارے دکھ خوشی خوشی برداشت کر رہے تھے کہ پچھلی کئی پشتوں سے ''پل صراط'' پر چلتے ہوئے ان کے خاندان کو پانچ بیٹوں کو سنبھالا مل گیا تھا۔حالانکہ یہ پانچوں بیٹے ان کے کسی کام نہ آسکے۔نہ کوئی خدمت کرنے کا اہل ہو سکا نہ کوئی خدمت کر سکا۔ان کی اپنی ساری زندگی ہی مشقت کرتے گزر گئی۔۔۔ اباجی کو کبھی کبھی غصہ بھی آتا اور یہ غصہ عام طور پر گھر کے گھڑوں اور برتنوں پر اترتا تھا۔لیکن جب شام کو اباجی گھر آتے،ان کے ایک ہاتھ میں نیا گھڑا اور دوسرے ہاتھ میں گلاب کے پھولوں کے ہار ہوتے اور جھگڑا ختم۔

۱۹۵۰ء میں اباجی اچانک بیمار ہوئے تھے۔اس علالت میں عجیب وغریب قسم کے دورے پڑتے تھے۔باباجی کے بیان کے مطابق اباجی کو چار چار پانچ پانچ کڑیل جوانوں نے دبایا ہوتا تھا مگر اباجی اس طرح اٹھ بیٹھتے کہ انہیں دبانے والے لڑھکتے ہوئے اِدھر اُدھر جا پڑتے۔ اباجی نے اس سلسلہ میں جو احوال سنایا،اس کے مطابق ان کے اوپر ایک بہت بڑا فانوس نصب تھا، حالانکہ تب ہمارے گھر میں بجلی ہی نہیں آئی تھی۔اس فانوس سے سبز رنگ کی روشنی نکلتی تھی جو آنکھوں کو خیرہ کرتی تھی۔اسی روشنی کے ذریعے ان کی بہت سے بزرگوں سے ملاقات ہوئی۔اباجی کے بقول ایک مرحلے پر انہیں خود علم ہوگیا تھا کہ ان کی جان نکل رہی ہے۔ٹانگوں سے بالکل جان نکل چکی تھی مگر پھر انہیں دنیا میں مزید(۳۶ سال) جینے کی اجازت مل گئی۔اباجی کی زندگی کی یہ سنگین بیماری،جس کے باعث سارے عزیز ان کی زندگی سے مایوس ہو چکے تھے حقیقتاً کوئی بیماری تھی یا کوئی روحانی تجربہ تھا،میں اس بارے میں تو کوئی حتمی بات نہیں کر سکتا تاہم بعد میں ان کی زندگی میں خواب بینی،دم درود اور کشوف کا جو سلسلہ نظر آتا ہے وہ اسی تجربے سے ہی مربوط محسوس

ہوتا ہے۔ واللہ اعلم!

میری پیدائش سے چند ماہ پہلے ابا جی نے یکے بعد دیگرے دو خواب دیکھے تھے۔ پہلا خواب یہ تھا کہ ایک بڑا اور گھنا درخت ہے جس کی شاخیں دور دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ ابا جی اس درخت کے اوپر عین درمیان میں کھڑے ہوئے ہیں۔ یہ خواب سن کر ابا جی کے ایک دوست روشن دین صاحب نے کہا کہ آپ کے ہاں بیٹا پیدا ہوگا جو.....

دوسرا خواب یہ تھا کہ لمبے لمبے قد والے بہت سارے لوگ ہیں جو اپنے ہاتھ بلند کر کے ''حیدر۔۔حیدر'' کے نعرے لگا رہے ہیں۔ ان دونوں خوابوں کے چند ماہ بعد میری پیدائش ہوئی۔ ابا جی نے اپنے مرشد کو خط لکھا کہ بیٹے کا نام تجویز فرما دیں۔ مرشد کو ابا جی کے خواب کا علم نہیں تھا۔ انہوں نے مجھے حیدر بنا دیا۔ مگر ابا جی کے دونوں خوابوں کی تعبیر کا ابھی تو دور دور تک کوئی نشان نہیں ملتا۔ شاید حسنِ اتفاق تھا کہ میں پیدا ہو گیا اور حیدر نام رکھا گیا۔

میں بچپن میں شرارتیں بہت کرتا تھا۔ دوسروں کو ڈرانے میں مزہ آتا تھا۔ اسی وجہ سے بچپن میں ابا جی سے بڑی مار کھائی۔ سب سے زیادہ مار بھی میں نے کھائی اور ابا جی کی توجہ بھی سب سے زیادہ مجھے ملی۔ یہ ابا جی کی ذاتی توجہ ہی تھی جس کے باعث اسکول میں داخلہ کے وقت مجھے کچی، پکی کی بجائے براہ راست دوسری جماعت میں داخل کر لیا گیا۔ شادی کے بعد بھی ایک دفعہ ابا جی سے تھپڑ کھایا۔ یوں تو والدین کی محبت ساری اولاد کے لئے یکساں ہوتی ہے لیکن میرا خیال ہے کہ ابا جی کو آپی سے اور مجھ سے سب سے زیادہ پیار تھا۔ زبیدہ کے لئے فکرمندی زیادہ رہی جبکہ اعجاز سب سے چھوٹا ہونے کی وجہ سے لاڈلا رہا۔

موسیقی سے ابا جی کو رغبت نہیں تھی لیکن اسے شجرِ ممنوعہ بھی نہیں سمجھتے تھے۔ ایک پرانا گانا ''ڈاچی والیا موڑ مہار وے'' سن کر کہتے یہ تمہارے دادا کو بہت پسند تھا۔ ابا جی کو حضرت خواجہ غلام فریدؒ کی کافیاں پسند تھیں۔ عام طور پر تحت اللفظ کے ساتھ پڑھتے۔ کبھی کبھار اپنے آپ میں گنگنا بھی لیتے۔ عنایت حسین بھٹی کی آواز میں خواجہ صاحب کی کافی ''ساکوں سجناں دے ملن دی تانگ اے'' سن کر جھوم سے اٹھتے۔ انھی کی وجہ سے ہی شاید مجھے لوک گیتوں اور صوفیانہ شاعری

سے دلچسپی ہوئی۔ ایک ہلکی سی مسکراہٹ عموماً ابا جی کے چہرے پر رہتی تھی۔ جملے باز نہیں تھے مگر اچھے جملے پر دل کھول کر داد دیتے تھے۔ ہنسی کی کسی بات پر اگر کھل کر ہنستے تو اتنا ہنستے کہ آنکھوں سے آنسو نکل آتے۔ ان کی اس کیفیت پر میرا جی کا شعر یاد آ گیا ہے:

نہیں گریہ و خنداں میں فرق کچھ بھی　　　جو ہنستا گیا دل تو روتا گیا دل

ابا جی کی شخصیت کا جادو ایسا ہے کہ آج بھی رحیم یار خاں کے ان کے پرانے احباب سے ان کا ذکر کریں تو ان کی باتیں سناتے سناتے آبدیدہ ہو جاتے ہیں۔ رحیم یار خاں کے پرانے محلے سے جا کر پتہ کریں تو ابا جی کا نام سنتے ہی ان کے چہروں پر محبت کی چمک آ جاتی ہے۔ میں تقریباً دس سال کے بعد پہلی دفعہ پرانا مکان دیکھنے گیا تو نہ صرف اڑوس پڑوس کے سارے لوگ جمع ہو گئے بلکہ اتنی محبت سے اپنے گھروں میں لے گئے کہ میں ان محبتوں پر حیران رہ گیا۔ گھر کی لڑکیوں، عورتوں میں سے کسی نے پردہ نہ کیا، بوڑھیوں نے سر منہ چوم لیا۔ یہ ساری محبتیں حقیقتاً ابا جی کے وسیلے سے نصیب ہوئیں۔ شوگر مل میں آج بھی ان کی بات کی جائے تو کوئی ایک شخص بھی ایسا نہیں ملے گا جو شرارتاً ہی ان کے کردار پر انگلی اٹھا سکے۔ دراصل ابا جی صراطِ مستقیمی آدمی تھے۔ ایسا بننے کے لئے بڑی کٹھن ریاضت اور حوصلے کی ضرورت ہوتی ہے۔ میں بھی صراطِ مستقیمی بننے کی کوشش کرتا ہوں مگر زگ زیگ چلتا ہوں کیونکہ مجھے احساس رہتا ہے کہ لکیریں اپنے فقیروں کو کھا جاتی ہیں۔

شروع میں ابا جی کے ساتھ تعلق میں احترام کے باعث ایک حجاب یا فاصلہ سا تھا مگر رفتہ رفتہ یہ حجاب کم ہوتا گیا۔ یکسر ختم تو نہیں ہوا مگر ہمارے درمیان اتنی بے تکلفی ضرور ہو گئی کہ انسانی زندگی کے بعض حساس موضوعات پر ہم اطمینان سے گفتگو کر لیتے تھے۔ بعض مسائل میں انہوں نے میری رہنمائی بھی کی۔ میرے مقابلے میں ابا جی اپنے پوتوں سے زیادہ بے تکلف تھے۔ زلفی، شازی، ٹیپو تینوں ان کے ساتھ فری تھے۔ ابا جی ان کے ساتھ مختلف گیمز کھیلتے، مزے سے ہارتے اور پھر پوتوں کی بے تکلف ہوٹنگ سے لطف اندوز ہوتے۔ پہلے پہل جب میں نے شازی کو ہوٹنگ کرتے دیکھا تو اس کی بدتمیزی کو محسوس کرتے ہوئے اسے سختی سے ڈانٹا مگر اسی وقت ابا جی کی

جوابی ڈانٹ مجھے پڑی کہ جیسے کرتے ہیں کرنے دو۔۔تو میں نے دادا، پوتوں کی بے تکلفی سے خود کو الگ کرلیا۔

علالت کی حالت میں اباجی باربار مجھے اور آپی کو یاد کرتے رہے یا پھر ٹیپو، مانو اورانس (چھوٹے پوتوں اور پوتی) کو یاد کرتے رہے۔آپی نے کراچی میں کوئی خواب دیکھااور گھبرا کرازخوداباجی کے پاس پہنچ گئی۔اباجی نے آپی کو گلے سے لگالیا۔دیرتک روتے رہےاور پھر کومے کی حالت میں چلے گئے۔جب میں پہنچا کومے کی حالت میں تھے۔باقی بہن بھائی بھی جمع ہونے لگے۔شاہدہ، بے بی، اکبر، طاہر، اعجاز سب آ گئے۔زبیدہ امریکہ میں تھی اس کا آنا ممکن نہ تھا۔نوید نے پہنچنے میں تھوڑی دیر کردی۔۔نوید آ گیاتو پانچوں بیٹے باپ کے سرہانے کھڑے ہوگئے۔باری باری سب نے سامنے آ کراپنانام لیا۔ہرآواز پراباجی نے آنکھیں کھولیں اوران کی آنکھوں میں غروب ہوتے ہوئے زندگی کے سورج نے ہر بیٹے، بیٹی اورعزیز کوخداحافظ کہااور پھر وہ ہمیشہ کے لئے ہم سے جدا ہوگئے۔

اباجی کی وفات کے بعدایک دوست نے تعزیتی خط میں لکھا کہ میں جب بھی خانپور میں قیام کے دنوں میں آپ کے گھر پردستک دیتا۔اگرآپ کےاباجی آتے اورمیں ان سے آپ کا پوچھتا تو آپ کا نام سنتے ہی ان کی آنکھوں میں چمک سی پیدا ہوتی اور ہونٹوں پرمسکراہٹ پھیل جاتی۔

رحیم یارخاں کےقریب ایک گاؤں ''بستی قندھاراسنگھ''(یاشاید بستی گندھاراسنگھ) کی ایک فیملی سے ہمارے رشتہ داروں جیسے تعلقات ہیں۔اباجی کی وفات کے بعد خالہ فاطمہ وہاں سے تعزیت کے لئے آئیں توانہوں نے بتایا کہ ان کے بھائی شاہ محمد صاحب پورے خاندان سمیت بھارتی پنجاب سے سیدھے اسی گاؤں میں آئے تھے۔عید سے چند دن پہلے اباجی کی دکان پر گئے اورانہیں سونے کے کڑے دے کر کہنے لگے کہ اسے گروی رکھ کرہمیں کپڑا اُدھار دے دیں تا کہ بچوں کی عید ہوجائے۔اباجی ان کی پسند کے مطابق کپڑا دیتے چلے گئے۔جب ان کا مطلوبہ سارا کپڑا دے دیا تو اباجی نے سیف سے سو روپے کا نوٹ نکالا اور شاہ محمد صاحب سے کہا یہ میری طرف سے آپ کے بچوں کے لئے عیدی ہے۔سونے کے کڑے واپس لے جائیے اور کپڑوں کی

رقم جب سہولت کے ساتھ دے سکیں، دے جایئے۔۔کسی شناسائی کے بغیر اس سلوک پر شاہ محمد صاحب پہلے حیران ہوئے پھر آبدیدہ ہوگئے۔نتیجتاً ان کے خاندان کے افراد سے آج بھی ایسا گہرا تعلق بنا ہوا ہے جو بعض رشتہ داروں کے ساتھ بھی نہیں ہے۔البتہ خالہ فاطمہ کے اس انکشاف کے بعد مجھے یہ اندازہ ضرور ہوگیا کہ اباجی کا کپڑے کا اچھا بھلا کاروبار زوال کا شکار کیوں ہوا۔

اباجی کی وفات کے بعد ہم نے ان کی میّت کو سر سے پیروں تک گلاب کے پھولوں سے بھر دیا تھا اور پھولوں سمیت ہی دفن کیا تھا۔وفات کے تیئسویں دن، رات کے نو بجے کے بعد اس کمرے کی کھڑکی سے گلاب کی خوشبو کی تیز لپٹیں اٹھنے لگیں جو اباجی کا ذاتی کمرہ تھا۔یہ خوشبو پہلے امی جی نے محسوس کی اور مجھے کمرے میں بلایا۔کمرے میں داخل ہوتے ہی مجھے گلاب کی تیز خوشبو کا احساس ہوا۔میں نے حیرت سے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے لمبے لمبے سانس لینے شروع کر دیئے۔میری ایک کزن خالدہ کے دیور شاہد حسین بھی اس وقت ہمارے گھر آئے ہوئے تھے۔میں نے انہیں بھی کمرے میں بلالیا۔انہوں نے بھی حیرانی کے ساتھ خوشبو کی موجودگی کی تصدیق کی۔خوشبو اتنی تیز تھی کہ باہر کی گلی میں بھی ہلکی ہلکی محسوس ہو رہی تھی جبکہ کھڑکی سے تو خوشبو کا سیلاب اُمڈ رہا تھا۔ایک دن کے وقفے کے بعد دوپہر کو تقریباً ساڑھے بارہ بجے اسی کمرے میں پھر گلاب کے پھولوں کی تیز خوشبو پھیل گئی۔اس خوشبو کو میں نے کمرے میں آ کر محسوس کیا اور پھر آوازیں دے کر سارے افراد خانہ کو جمع کر لیا۔سب نے ہی خوشبو کو محسوس کیا۔چند منٹ کے بعد خوشبو غائب ہوتی چلی گئی۔دونوں دفعہ خوشبو کا جانا ایسے لگا جیسے کوئی انسان آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے ہوئے کمرے سے نکل رہا ہو۔

باباجی نے مجھے کہا کہ اگر تم اس معاملے میں دوسروں سے بات نہ کرتے تو یہ خوشبو وقتاً فوقتاً تمہاری ماں کو اور تمہیں ملتی رہتی۔شاید خوشبو سے بڑھ کر بھی کچھ رونما ہوجاتا۔مگر تم نے اس کا بھید افشا کر کے خود کو اس سے محروم کر لیا ہے۔باباجی کی باتیں باباجی جانیں۔لیکن یہ خوشبو کیا تھی؟۔۔اتنی سی بات ہی سمجھ میں آتی ہے کہ اگر آنکھ خواب تخلیق کر سکتی ہے تو قوتِ شامہ بھی خوشبو تخلیق کر سکتی ہے۔

☆☆☆

مائے نی میں کنوں آکھاں

(امی جی)

ماں! ترے بعد سے سورج ہے سوا نیزے پر
بس تری ممتا کا اک سایہ بچاتا ہے مجھے

''راج دلارے!
او میری اکھیوں کے تارے
میں تو واری واری جاؤں۔۔راج دلارے.....''

یہ مشہور لوری میں نے کوثر پروین کی آواز سے پہلے اپنی امی جی کی آواز میں سنی۔امی جی نے یہ لوری اپنے سارے بیٹوں میں سے صرف میرے لئے گائی۔ ماں کی محبت اور دعاؤں سے بھری اس لوری نے مجھے پروان چڑھایا۔امی جی کی وفات سے کوئی سال بھر پہلے مجھے چند ماہ گوجرانوالہ میں گزارنے پڑے۔ وہیں ایک روز شام کا کھانا ایک ہوٹل میں کھا رہا تھا۔اچانک یہ لوری کیسٹ پلیئر سے نشر ہونے لگی۔لوری شروع ہوتے ہی میں جیسے بچہ بن گیا اور میں نے دیکھا کہ امی جی نے مجھے۔۔ چھ ماہ کے بچے کو۔۔گود میں اٹھایا ہوا ہے اور لوری سنا رہی ہیں لوری ختم ہوگئی۔۔ میں بچپن عبور کرکے اپنی اصل عمر تک پہنچا تو دیکھا کہ، میں جو ابھی ماں کی گود میں کھلکھلا رہا تھا، میری آنکھیں بھیگی ہوئیں تھیں۔عجیب سا تجربہ تھا۔کئی بار سوچا امی جی کو اس تجربے سے آگاہ کروں گا مگر پہلی محبت کے اظہار کی طرح اس تجربہ سے امی جی کو آگاہ نہ کرسکا یہاں تک کہ وہ وفات پا گئیں۔

پہلی محبت سے یاد آیا کہ میری پہلی محبت بھی میری امی جی ہیں اور آخری محبت بھی امی جی ہیں۔اس اوّل اور آخر کے بیچ میں بہت سی محبتیں آئیں مگر درحقیقت وہ سب میری پہلی اور آخری محبت کا عکس تھیں۔امی جی کا چہرہ کتابی اور گول چہرے کے بین بین تھا۔چنانچہ بیچ میں آنے والی میری ساری محبتیں بھی کتابی چہرے والی تھیں۔اپنی بیوی سے میری گہری دوستی کی وجہ شاید یہی ہے کہ امی جی کی بھتیجی ہونے کے ساتھ امی جی سے کافی مشابہت بھی رکھتی ہے۔ماہرین نفسیات اس کی جو چاہیں توجیہہ کرلیں، مجھے اعترافِ جرم سے عار نہیں۔

امی جی کی شادی کم عمری میں ہوئی۔ چودہ پندرہ برس کی عمر میں، تب ابا جی کی عمر تقریباً ستائیس برس تھی۔ابا جی سرائیکی تھے، امی جی پنجابی۔عمروں اور کلچر کے واضح فرق کے باوجود میاں بیوی کی محبت کا کمال یوں ظاہر ہوا کہ ابا جی دیکھنے میں پنجابی لگتے تھے اور امی جی سرائیکی لگتی تھیں۔ دونوں نے خود کو ایک دوسرے کے رنگ میں رنگ لیا تھا۔من تو شدم تو من شدی والا حال تھا۔

ہمارے معاشرے میں لگائی بجھائی کرنے والے ''پھاپھے کٹنی'' قسم کے کردار جا بجا نظر آتے ہیں۔ ہمارے عزیزوں میں بھی بعض ایسی خواتین موجود ہیں۔امی جی کی حالت یہ تھی کہ فساد کرانا تو ایک طرف، کوئی فساد کرنا چاہتا تو اس سے بھی کوسوں دور بھاگتیں۔کوئی آکر فساد کی تیلی لگا جاتا تو خود ہی رودھو کر چپ ہو جاتیں۔ بعد میں آپی اور بے بی بھی امی کی طرح نکلیں۔زبیدہ تو صبر جمیل میں امی جی سے بھی دو قدم آگے نکل گئی (اللہ اسے اپنی حفظ وامان میں رکھے) البتہ شاہدہ نے ہمت سے کام لیا۔اس معاملہ میں امی جی کی پیروی نہیں کی۔نہ صرف خود بولنے میں مہارت حاصل کی بلکہ بے بی جیسی بے زبان کو بھی زبان عطا کردی۔اللہ کرے زورِ زباں اور زیادہ!

امی جی محبت، وفا اور ایثار کی روشن مشرقی مثال تھیں۔شادی کے ابتدائی چند برسوں کے بعد ابا جی کا کاروبار زوال کا شکار ہوتا گیا۔انتہائی تنگ دستی تک نوبت پہنچی۔امی جی نے خدا سے تو شکوہ کرلیا مگر مجازی خدا سے کبھی شکایت نہیں کی بلکہ ہر رنگ میں ہمت بندھاتی رہیں۔خدا سے شکوہ بھی اپنی جگہ ایک اہم واقعہ ہے۔امی جی نے بے حد تنگ دستی کے باعث ایک بار انتہائی دکھ کے ساتھ کہا: خدایا! تو کہیں ہے بھی سہی یا نہیں؟۔۔اسی رات امی جی نے خواب دیکھا: نہایت تیز

روشنی ہے۔ جب اس کا منبع ڈھونڈ نا چاہتی ہیں تو بڑی پُر ہیبت آواز آتی ہے۔۔ ’’حمیدہ! ادھر دیکھو میں تمہارا خدا ہوں‘‘۔خوف اور رعبِ خداوندی سے امی جی کی آنکھ کھل گئی۔سخت سردی کے موسم میں پسینے سے شرابور ہوگئیں۔اُس دن سے لے کر موت کے دن تک پھر امی جی کو خدا کے وجود کے بارے میں کبھی شک نہیں ہوا۔

اباجی کی ’’وِل پاور‘‘ کے کئی کرشمے دیکھنے کے باوجود امی جی نے انہیں بزرگ تسلیم کرنے سے ہمیشہ انکار کیا۔ اس معاملہ میں ہمیشہ ہی اباجی کو چھیڑتی رہیں اور ہار کر بھی ہار نہیں مانتی رہیں۔۔ایک دفعہ کسی اَٹکے ہوئے کام کی وجہ سے امی جی فکرمند تھیں۔ میں نے ازراہ مذاق کہا چلیں اگر آپ کا یہ کام ہو جائے تو پھر مجھے بزرگ مانیں گی؟۔۔فوراً بولیں: میں نے تمہارے باپ کو ساری زندگی بزرگ نہیں مانا تمہیں کیسے مان لوں گی۔چل بھاگ جا۔انگریز کی ولایت کا ویزا لگوا نہیں سکتا اور چلا ہے خدائی ولایت کی طرف۔

میرے چھوٹے بیٹے ٹیپو کی عمر پانچ سال تھی۔ جب اس نے مجھ سے سوال کیا کہ اللہ میاں کہاں ہے؟ میں نے اسے سمجھایا کہ بیٹا! ہم اللہ میاں کو دیکھ نہیں سکتے۔اس نے فوراً اعتراض کیا کیوں نہیں دیکھ سکتے؟۔۔ میں نے سوچا چھوٹا بچہ ہے اسے اس کے ذہن کے مطابق سمجھاتا ہوں۔چنانچہ میں اسے سورج کے سامنے لے گیا اور کہا سورج کی طرف دیکھو۔۔۔
اس نے دیکھنے کی کوشش کی اور پھر بے بسی سے کہا میں نہیں دیکھ سکتا۔تب میں نے اسے سمجھایا کہ اللہ میاں کا نور اس سے بھی زیادہ تیز ہے اس لئے ہم اسے نہیں دیکھ سکتے۔میں نے یہ قصہ امی جی کو بتایا وہ ہنس کر چپ ہوگئیں۔اگلے دن ٹیپو نے اپنے چھوٹے چچا اعجاز کی گہری سیاہ عینک پہنی، سورج کی طرف دیکھنے کی پریکٹس کی اور پھر میرے پاس آیا۔’’میں اب سورج کی طرف دیکھ سکتا ہوں‘‘۔ یہ کہہ کر اس نے عینک پہنی اور سورج کو دیکھنے کا مظاہرہ دکھایا اور پھر مطالبہ کیا کہ اب اللہ میاں بھی دکھایئے۔میں ٹیپو کے مطالبے پر چکرا گیا مگر امی جی نے ٹیپو کو پیار سے گود میں اٹھالیا اور کہنے لگیں بیٹے اگر تم اس مقام تک آ گئے ہو تو ایک نہ ایک دن اللہ میاں کو بھی دیکھ لوگے۔ پھر مجھے کہنے لگیں پہلے انوکھے لاڈلے چاند مانگتے تھے مگر یہ تو اللہ میاں سے کم پر راضی ہی نہیں ہوتا۔

امی جی میں جمالیاتی ذوق کی فراوانی تھی۔ستم ہائے زمانہ نے اسے کچلا تو دیا مگر ختم نہ کر سکا۔ امی جی نے ایک زمانے میں پنجابی میں ایک طویل دعائیہ نظم کہی تھی اس کی ردیف ’’مولا‘‘ اور قافیہ دعا، صدا وغیرہ تھا۔اتنا ہی مجھے یاد ہے۔افسانے اور ناول پڑھنے کا شوق بھی انہیں ایک عرصہ تک رہا۔ میری ادبی سرگرمیوں کی حوصلہ افزائی کرتیں۔کسی اہم پیشرفت کی خبر سن کر خوش ہوتیں۔ میرے متعدد افسانوں میں امی جی کا کردار اپنی توانائیوں کے ساتھ براہ راست موجود ہے۔’’دھند کا سفر‘‘۔’’آپ بیتی‘‘ اور ’’روشنی کی بشارت‘‘ یہ تینوں افسانے ان کی زندگی میں ہی ’’نگار پاکستان‘‘ ’’اوراق‘‘ اور ’’جدید ادب‘‘ میں چھپ گئے تھے۔’’روشنی کی بشارت‘‘ پڑھ کر کہنے لگیں کبھی میں تمہیں کہانیاں سنایا کرتی تھی اور اب تم میری کہانیاں بنانے لگ گئے ہو۔ چہرے پر مسّرت تھی۔امی جی کے تبصرے نے بچپن کے کتنے ہی حسین مناظر کی فلم آن کر دی:

نصف شب
جیسے خوشبو بھری گود
رِستے ہوئے زخم پر جیسے پھاہا/ بدن کو تھپکتی ہوئی چاندنی
سر کے ژولیدہ بالوں میں پھرتی ہوئی/ریشمی انگلیاں
ماں کے ہونٹوں کی لَو پر
سلگتی ہوئی اک کہانی کے پر
سات رنگوں کے پر
قاف کی اُس پری کے
جسے ڈھونڈنے کے لئے شاہزادہ
پہاڑوں کی جانب روانہ ہوا!

وفات کے بعد امی جی میری شاعری میں بھی آنے لگیں:

یہ ساری روشنی حیدؔر ہے ماں کے چہرے کی   کہاں ہے شمس وقمر میں جو نور خاک میں ہے

روایت ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ ماجدہ وفات پا گئیں اور حضرت موسیٰ

علیہ السلام حسبِ عادت دربارِ خداوندی میں بے تکلفی سے جانے لگے تو آواز آئی: موسیٰ! احترام کو ملحوظ رکھو۔ وہ فوت ہوگئی جو ہر وقت تمہارے لئے دعائیں کرتی رہتی تھی اور جس کی دعاؤں کے طفیل تمہاری بے تکلفی برداشت کر لی جاتی تھی۔ وہ دعائیں کرنے والی نہیں رہی تو اب پورے احترام کے ساتھ آؤ۔ خدا جانے یہ روایت کس حد تک درست ہے تاہم اس سے ظاہر ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسے جلیل القدر، عالی مقام اور کلیم اللہ کے لقب کے حامل پیغمبر کے گرد بھی ماں کی دعاؤں کا بہت بڑا حفاظتی حصار تھا۔۔ میں نہایت کمزور، عاجز اور گنہگار انسان ہوں۔ مجھے بھی امی جی کی زندگی تک ان کی دعاؤں کا بڑا سہارا رہا۔ زندگی میں جب بھی کچھ ٹھان لیا، کر گزرا۔ اس میں کامیاب نہیں ہوا تو نقصان سے بھی بچتا رہا۔ امی جی کی وفات کے بعد میں نے محسوس کیا کہ اب قدرت کی طرف سے پہلے جیسی رعائت نہیں مل رہی۔ اس حقیقت کو محسوس کر کے میں نے کہا تھا:

حیدر اب اپنی عادتیں، اطوار ٹھیک کر
ابا بھی چل بسے تری ماں بھی نہیں رہی

بچپن میں۔۔امی جی نے ایک دفعہ میری شرارتوں سے تنگ آ کر مجھے ابا جی کے ساتھ دوکان پر بھجوا دیا۔ ابا جی نے وہاں سزا کے طور پر میری ٹنڈ کرا دی۔ میں خوشی سے چھلانگیں مارتا ہوا گھر آیا اور امی جی سے کہا: امی جی، امی جی۔۔ میں بھی ابو کی طرح ہو گیا ہوں اب میں بھی ابو بن جاؤں گا اور پھر اپنے بچوں کو ڈانٹا کروں گا۔

رحیم یار خاں میں ہماری ایک ہمسائی بوا زیبو ہوتی تھیں۔ ان کے بیٹے ظفر سے ہم عمری کے باعث دوستی تھی۔ اس سے میں نے سرائیکی زبان میں ایک سلیس قسم کی گالی سنی جو اس نے اپنے گدھے کو دی تھی۔ مجھے وہ گالی بہت اچھی لگی۔ ایک اور موقعہ پر میں نے بھی ان کے گدھے کی شان میں وہی گالی 'ارشاد' کر دی۔ امی جی کو پتہ چلا تو میری خوب مرمت ہوئی۔ وہ دن اور آج کا دن، پھر وہ گالی میرے منہ پر چڑھ ہی نہیں سکی۔

ہم خانپور میں تھے۔ میں غالباً ساتویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ امی جی کو کسی کام کے سلسلے

میں کراچی میں مقیم خالہ سعیدہ اور ماموں کوثر کے ہاں جانا پڑ گیا۔ امی جی کو گئے ابھی تیسرا یا چوتھا دن تھا کہ میں نے دوپہر کے وقت با آواز بلند رونا شروع کر دیا۔ ابو جی پریشان۔۔ کہ معاملہ کیا ہے۔ مجھ سے بار بار پوچھیں کیا ہوا ہے؟ مگر شدّتِ غم سے منہ سے الفاظ ہی نہیں نکلتے تھے۔ بڑی مشکل سے ہچکیوں کے دوران ایک دو دفعہ امی۔ امی کہہ سکا۔ ابا جی بھی شاید اداس بیٹھے تھے۔ میرے رونے کا بہانہ ان کے ہاتھ لگ گیا، جھٹ امی جی کو تار بھیج دیا اور امی جی واپس آ گئیں۔

امی جی فوت ہوئیں تو میں ساکت ہو گیا۔ آنکھیں ڈبڈبا گئیں مگر ساون بھادوں کی وہ برسات نہ ہوئی جو دو سال پہلے ابا جی کی وفات پر ہوئی تھی۔ اس بارے میں مجھے ابھی تک ایک مجرمانہ سا احساس ہے۔ کبھی سوچتا ہوں ابا جی کو امی جی کی ہم سے زیادہ ضرورت تھی۔ شاید اسی لئے موسلا دھار بارش نہیں ہوئی۔ کبھی خیال آتا ہے کہ میں تو امی جی کے حصے کا بھی ابا جی کی وفات پر ہی رو چکا ہوں کیونکہ امی جی تو ابا جی کی وفات کے ساتھ ہی فوت ہو گئیں تھیں۔ وہ تو صرف دعاؤں کا ایک مجسمہ تھا جو ہمارے ساتھ تھا، اب وہ بھی نہیں رہا۔ لیکن کبھی کبھی جب ماں کے سمندر وجود اور اپنے جزیرے پن کا احساس جاگتا ہے تو مجرمانہ احساس جیسے زائل ہونے لگتا ہے:

کبھی جب رات ڈھلتی ہے
فلک سے قطرہ قطرہ اوس کی برکھا اترتی ہے
کبھی جب پیاس کی شدت میں زخمی ہونٹ
بہتی تیز ندی کے سجل سینے پہ جھکتے ہیں
کبھی جب آنکھ رِستی ہے۔
تو یوں لگتا ہے جیسے ہم کبھی بچھڑے نہیں اس سے
کہ جیسے ہم جزیرے ہیں
تھپکتے، لوریاں دیتے سمندر کے
بلکتے زرد رُو بیمار بچوں کی طرح چمٹے ہوئے ہیں
ہماری ہجرتوں کی داستاں جھوٹا فسانہ ہے!

امی جی بیک وقت باحوصلہ بھی تھیں اور کمزور دل بھی۔۔باحوصلہ اس طرح کہ نہایت کٹھن اور دکھ بھری زندگی کو ہمت اور صبر کے ساتھ بسر کیا۔کمزور دل اس طرح کہ بادلوں کی گرج اور بجلی کی کڑک سے بھی سہم جاتیں۔رحیم یار خاں قیام کے زمانے میں ایک بار ابا جی دوکان سے جلد واپس نہ آسکے۔امی جی نے سرِشام ایک ہمسائی نانی اللہ وسائی کو گھر پر بلالیا۔نانی اللہ وسائی امی جی سے بھی زیادہ کمزور دل تھیں۔اچانک بادل زور سے گرجے اور بجلی کڑکتی چلی گئی۔نانی اللہ وسائی اور امی جی نے بیک وقت زور سے چیخ ماری اور ایک دوسری سے چمٹ گئیں۔ابا جی جب بھیگتے بھاگتے گھر پہنچے،امی جی نے رورو کر بُرا حال کرلیا۔پھر ابا جی سرِشام ہی گھر آجایا کرتے تھے،لیٹ نہ ہوتے تھے۔

امی جی کو جب شوگر کی شکایت ہوگئی تو میں نے احتیاطی تدابیر کی طرف توجہ دلائی مگر ان کا ایک ہی جواب تھا،اگر میٹھی چیزیں کھانے سے موت آتی ہے تو آنے دو۔میں نے بہت زیادہ اصرار کیا تو امی جی نے دودھ بغیر چینی کے پینا شروع کردیا مگر مٹھائی کو پرہیزی لسٹ میں شامل کرنے کے لئے وہ آخر دم تک تیار نہ ہوئیں۔بالآخر میٹھی چیزیں کھا کر ہی جان،جانِ آفریں کے سپرد کردی۔۔ابا جی کی وفات کے بعد دراصل امی جی میں زندہ رہنے کی خواہش ختم ہوگئی تھی۔یوں لگتا ہے جیسے وہ مٹھائی کو جان بوجھ کر بطور زہر کھا رہی تھیں۔اسی لئے ابا جی کی وفات کے بعد دوسال کے عرصے کے اندر ہی امی جی فوت ہوگئیں۔

امی جی مجھے ڈاکٹر بنانے کی خواہش مند تھیں۔میرا ذہن شروع سے ہی ''نان میڈیکل'' بلکہ ''نان سائینس'' تھا۔ایک مرحلہ پر سوچا کہ اردو میں پی ایچ ڈی کی ڈگری لے لوں۔نام کے ساتھ ڈاکٹر تو لکھا جاسکے گا۔پھر دیکھا کہ ایسے ایسے لوگ بھی ڈاکٹریٹ کر گئے ہیں کہ پی ایچ ڈی کہلانا باعث افتخار نہیں،باعث ندامت محسوس ہونے لگا ہے۔اس سے بہتر ہے آدمی ''گھر بیٹھے ہومیو پیتھک ڈاکٹر بنئے'' کورس کرلے۔اس سے خلقِ خدا کو فائدہ بھی نہیں ہوگا تو نقصان بھی نہیں ہوگا۔آخر یہ طے ہوا کہ جہاں میں امی جی کی اور بہت سی خواہشیں اور خوشیاں پوری نہیں کرسکا وہیں اس خواہش کی عدم تکمیل پر بھی ہلکے سے دکھ اور افسوس کے ساتھ ماندہ زندگی گزارلوں گا۔

امی جی کی گائی ہوئی لوری کا ایک ایک لفظ الٹ ہوگیا ہے۔ان کی اکھیوں کے تارے کی اپنی قسمت کا ستارہ ہی کہیں گم ہوگیا ہے۔امی کے باغ کا البیلا پھول وقت کے صحرا میں خود دھول ہورہا ہے۔جس کے مکھڑے کے آگے چاندنی میلی لگتی تھی اس کا رنگ روپ بگڑ چکا ہے۔حالات کا تپتا،دہکتا سورج سوا نیزے کے فاصلے پر آن کھڑا ہے۔اب تو صرف اُس جنت کی امید ہے جو ماں کے قدموں تلے ہوتی ہے:

ماں!ترے قدموں تلے جب راکھ اُڑتی ہے
تو سینے میں خلا جیسی کوئی شے گونجتی ہے
وہ گیت اب کھو گیا ہے
تو بھی اب چپ ہوگئی ہے اور خلا ویسے کا ویسا ہے
مرے سینے میں تیری مامتا کا نور اُترتا ہے
مگر کچھ بولتا بھی تو نہیں
اقرار کی ساعت ہمیشہ سے ادھوری ہے
نہ جانے کونسا کوہِ گراں ہے تیرے ہاتھوں پر....
یہ تو ہے یا کوئی خیمہ طنابوں کی شکست آثار مٹی سے نکل کر
زرد موسم کی ہوا میں لڑکھڑاتا ہے۔
یہ میں ہوں یا کوئی سایہ تری ممتا کی ٹھنڈی روشنی سے ٹوٹ کر
پاتال اندر ڈوبتا جاتا ہے
ہم دونوں
محبت کی گواہی کی طلب میں
اپنے اپنے دل کی جانب رُخ کئے اپنے خدا سے پوچھتے ہیں
حشر کب تک آئے گا۔۔!

☆☆☆

ڈاچی والیا موڑ مُہار وے

(داداجی)

ایک اَن دیکھے کی سوچوں میں گھرا رہتا ہوں میں
اُس کی آنکھیں اُس کا چہرہ سوچتا رہتا ہوں میں

میرے داداجی قیام پاکستان سے کئی برس پہلے فوت ہوگئے تھے۔ میں نے داداجی کو نہیں دیکھا مگر ان کے بارے میں اپنے دل میں ہمیشہ ایک انوکھی سی محبت محسوس کی۔ ان کے والد اور میرے پردادا حضرت میاں میر محمد گڑھی اختیار خاں کے پیروں میں شمار ہوتے تھے۔ حضرت خواجہ غلام فریدؒ کے روحانی دوست میاں درّ محمد (درّن سئیں) کے ساتھ رشتہ داری کا کچھ تعلق بھی تھا۔ پیری مریدی کا سلسلہ حضرت میاں میر محمد کو وراثت میں ملا تھا اور یہی ان کی زندگی تھا۔ داداجی اپنے آباء واجداد کے پیری مریدی کے مروّجہ سلسلے سے بیزاری سی محسوس کرتے تھے۔ اباجی اس سلسلے میں داداجی کی جوانی کا ایک واقعہ سنایا کرتے تھے۔ داداجی کے ایک رشتہ کے کزن نے ایک دن داداجی سے کہا ایک کام کے سلسلے میں میرے ساتھ چلو۔ کئی کوس کا سفر کرکے دونوں ایک خستہ جھگی تک پہنچے۔ وہاں ایک مفلوک الحال شخص اپنی بیوی، بچوں اور ایک گدھی کے ساتھ موجود تھا۔ داداجی کے کزن نے اس سے اپنا تعارف کرایا کہ میں تمہارے پیر گھرانے کا فرزند ہوں۔ وہ غریب بال بچوں سمیت ان کے قدموں میں بیٹھ گیا اور عقیدت کا جاہلانہ اظہار کرنے لگا۔ اس پرداداجی کے کزن نے اسے کہنا شروع کیا:

''دیکھو۔ تمہاری اس جھگی میں میرا حصہ ہے''

''سئیں''

''تمہارے بیوی بچوں میں میرا حصہ ہے''

''سئیں''

''تمہاری گدھی میں بھی میرا حصہ ہے''

''سئیں''

وہ غریب پیر سائیں کی ہر بات پر ''سئیں'' (بجا ارشاد!) کا اقرار کرتا گیا۔ آخر ان کے کزن نے کہا جاؤ نذرانہ لے کر آؤ۔ اس غربت زدہ نے جھگی کے اندر سے کچھ مصری لا کر پیر جی کی خدمت میں پیش کی اور داداجی اپنے کزن کے ساتھ لوٹ آئے۔۔ واپسی پر رستے میں داداجی نے اپنے کزن کو لعنت ملامت کی کہ اتنی سی مصری کے لئے مجھے اتنا لمبا سفر کرایا۔ جواباً کزن نے کہا: یار! مسئلہ مصری کا نہیں تھا مرید پکا کرنے کا تھا سو مرید پکا ہوگیا ہے۔ میرا خیال ہے اس طرح کے پیروں کو مریدوں کا ظالمانہ استحصال کرتے دیکھ کر ہی داداجی پیری مریدی کے سلسلے سے بیزار ہوئے ہوں گے۔ کیونکہ پھر انہوں نے گڑھی اختیار خاں میں اپنے والد کی وراثت نہیں سنبھالی۔ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر خانپور چلے آئے اور یہاں فقیری زندگی بسر کی۔ گڑھی اختیار خاں کے پرانے کاغذات میں شاید میرے پردادا میاں میر محمد کے نام کی زمینیں ابھی بھی موجود ہوں مگر داداجی نے نہ اپنی زمینوں کی طرف پلٹ کر دیکھا، نہ مریدوں کو قابو کرنے کا سوچا۔ آفرین ہے اباجی اور باباجی پر بھی کہ انہوں نے بھی اپنی پرانی زمینیں تلاش کرنے کی زحمت نہیں کی۔

خانپور میں داداجی نے ایک شریف گھرانے کی لڑکی ''صاحب خاتون'' سے شادی کی۔ یہ میری دادی تھیں۔ اباجی بتاتے تھے کہ وہ بمشکل چھ سال کے تھے جب ہماری دادی فوت ہوگئیں۔ اباجی نے ایک لمبی سی قمیص پہنی ہوئی تھی۔ قمیص کی طوالت کے باعث نیچے کسی شلوار یا جانگیہ کی اُس زمانے میں ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ قمیص کی جیب میں ریوڑیاں اور مکھانے بھر دیئے گئے تھے۔ اباجی بتاتے تھے میں نے اپنی اماں کی تدفین کا سارا منظر دیکھا تھا۔ زیادہ تر ریوڑیاں مکھانے کھا کر دیکھتا رہا۔ کبھی کبھار رونے بھی لگ جاتا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ دادی جان

رحیم یار خاں میں فوت ہوئی تھیں۔ جب تک ہم وہاں رہے ابا جی ہر محرّم کی دس تاریخ کو ہمیں ساتھ لے کر قبرستان جاتے۔ دادی جان کی قبر پر پھول پتے اور خاص طور پر کھجور کے پتوں کی چھڑیاں چڑھاتے۔ خیرات کرتے، دعا کرتے۔ خان پور چلے گئے تو پھر کبھی کبھار رحیم یار خاں دعا کے لئے چلے جاتے۔ ایک دفعہ رحیم یار خاں سے آئے تو اُداس اُداس تھے۔ خود ہی بتانے لگے میں ماں کی قبر بھول گیا ہوں۔ بہت تلاش کی، نہیں ملی۔ قبرستان بہت پھیل گیا ہے۔ قبرستان کے مین گیٹ پر ہی کھڑے ہو کر دعا کر آیا ہوں۔ اس کے کچھ عرصہ بعد ہم نے خانپور میں موجود دادا جی کی قبر پختہ کرالی تا کہ بعد میں یہ بھی گم نہ ہو جائے۔۔ دادا جی نے ابا جی اور بابا جی کو ماں بن کر بھی پالا اور باپ بن کر بھی پالا۔ جب کچھ بڑے ہو گئے تو ابا جی کو رحیم یار خاں میں ان کے ماموں کے سپرد کر دیا اور بابا جی کو ان کی پھوپھی بوا نور خاتوں کو سونپ دیا۔

دادا جی معمولی سا بیمار ہوئے اور فوت ہو گئے۔ گھر میں رونا پیٹنا مچ گیا۔ سارے عزیز و اقارب جمع ہو گئے۔ دادا جی کو غسل دے دیا گیا تو اٹھ کر بیٹھ گئے۔ وفات کی خبر سن کر آئے ہوئے سارے لوگ خوفزدہ ہو گئے۔ کچھ چیختے چلاتے گھر سے نکل بھاگے، ایک دو عزیز دہشت سے بے ہوش ہو گئے۔ ابا جی کو ''شادیٔ مرگ'' کا مطلب پوری طرح سمجھ میں آ گیا۔ دادا جی اُٹھ کر بیٹھ گئے اور فوراً کہنے لگے دوسری گلی سے اللہ رکھا کمہار کا پتہ کراؤ۔ وہاں سے پتہ کیا گیا تو معلوم ہوا کہ ابھی ابھی بیٹھے بیٹھے ہی فوت ہو گیا ہے۔۔ دادا جی نے ایک انوکھی کہانی سنائی۔ انہوں نے بتایا کہ مجھے دو سفید کپڑوں والے کہیں لئے جا رہے تھے کہ ایک مقام پر رُکنا پڑا۔ وہاں موجود کچھ اور سفید کپڑوں والوں نے ایک رجسٹر چیک کیا (اسے عالم بالا کا شناختی کارڈ آفس سمجھ لیں) دادا جی کو لے جانے والوں کو، چیکنگ کرنے والوں نے کہا: باری تو اللہ رکھا کمہار کی تھی تم لوگ اللہ رکھا قریشی کو لے آئے ہو۔ چنانچہ غلطی معلوم ہو جانے کے بعد دادا جی کو پھر اس دنیا میں واپس لایا گیا اور اسی وقت اللہ رکھا کمہار کی موت واقع ہو گئی۔ جہاں تک اس واقعہ کی صحت کا تعلق ہے ابا جی، بابا جی، بوا حیات خاتوں۔۔ سب نے یہ واقعہ اپنی چشم دید گواہی پر بیان کیا۔ چاچڑاں شریف اور کوٹ شہباز کے بعض دُور کے اور بوڑھے عزیزوں نے بھی تصدیق کی کہ ہم بھاگ نکلنے

والوں میں شامل تھے۔ اس قصے کا اصل بھید کیا تھا؟ یہ تو شاید کوہ ندا کی دوسری سمت جا کر ہی معلوم ہو سکے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ سفید کپڑوں والے سارے فرشتے سرائیکی زبان بول رہے تھے۔ ظاہر ہے انہیں علم تھا کہ ہمارے دادا جی صرف سرائیکی زبان ہی جانتے ہیں۔

دادا جی کے بارے میں مشہور تھا کہ کسی سائل کو خالی ہاتھ نہ جانے دیتے تھے۔ ابا جی نے بتایا تھا کہ ایک دفعہ دادا جی کے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ ایک سائل آ گیا۔ دادا جی نے کچھ سوچا اور پھر اپنی قمیص اتار کر اسے دے دی۔ خدا کا شکر ہے کہ اس کے فوراً بعد کوئی اور سائل نہیں آ گیا کیونکہ اس وقت دادا جی کے جسم پر صرف ایک چادر تھی جو انہوں نے نیچے باندھی ہوئی تھی اور یہ تو طے ہے کہ انہوں نے سائل کو بہر حال خالی ہاتھ نہیں جانے دینا تھا۔ یہ جملہ لکھتے ہوئے مجھے ایسا لگا ہے جیسے دادا جی عالم بالا سے ہی میری شرارت پر مسکرا رہے ہیں اور ابا جی سے کہہ رہے ہیں: ''غلام سرور! ڈیکھ گھِن اپنڑے پتر دے لقا'' (غلام سرور! اپنے بیٹے کی شرارت دیکھ لو)۔

دادا جی کو باز پالنے کا بہت شوق تھا۔ شکار کے شوقین تھے۔ باز کے ساتھ شکار کھیلتے۔ گھر پر زیادہ تر شکار کا گوشت پکتا جو عموماً تیتر کا ہوتا تھا۔ شکار کے لئے کمان نما غلیل بھی استعمال کرتے تھے۔ یہ غلیل ایک عرصہ تک خانپور میں ہمارے پاس محفوظ رہی۔ میں اسے کمان سمجھتا تھا۔ ۱۹۷۳ء میں خانپور میں قیامت خیز سیلاب آیا تو ہمارا گھر گر گیا۔ وہ غلیل اسی سیلاب کی نذر ہو گئی۔

دادا جی کے دور میں ان کے علاقے میں زندگی محدود تھی، وژن محدود تھا، دادا جی ان حدود سے کچھ آگے نکلنا چاہتے تھے سو محدود زندگی کی قید سے نکل کر لامحدود کی فضاؤں میں پرواز کرنے کے لئے کبھی کبھی افیون استعمال کر لیتے تھے۔ میں دادا جی کو انقلابی آدمی سمجھتا ہوں کیونکہ اُس زمانے میں بنے بنائے، بندھے بندھائے مرید چھوڑ کر آزاد نکل جانا بہت بڑا انقلابی قدم تھا۔ وہ روحانیت کا ڈھونگ رچا کر سادہ لوح لوگوں کے جذبوں کا استحصال نہیں کرنا چاہتے تھے۔۔ دادا جی جسمانی لحاظ سے دبلے پتلے تھے مگر ان کا جسم کسرتی تھا۔ شکار کے شوق کے باعث ان میں پھرتیلا پن بہت تھا۔ رنگ سانولا مگر نقش تیکھے تھے۔ ہماری بہن شاہدہ کو دیکھ کر بابا جی اکثر کہا کرتے تھے یہ ہمارا ابا ہے۔

امی جی نے دادا جی کو نہیں دیکھا تھا۔امی جی بتاتی تھیں کہ ایک دفعہ ابا جی کسی بات پر امی جی سے ناراض ہوئے۔ پھر حسبِ عادت صلح بھی کر لی مگر ابا جی کی ناراضگی کے باعث امی جی کے دل پر گہرا اثر تھا۔اسی حالت میں سو گئیں۔خواب میں دیکھا کہ ہمارے دادا جی آئے ہیں۔انہوں نے امی جی کے سر پر دست شفقت رکھا، پیار کیا۔امی جی کو کچھ نقدی دی اور کہا: میں غلام سرور کو ڈانٹوں گا آئندہ تمہیں رنج نہیں دے گا۔امی جی کی آنکھ کھلی تو بے حد حیران ہوئیں۔ابا جی کو سارا خواب سنا کر دادا جی کا حلیہ بھی بتایا۔ابا جی بھی حیران ہوئے کیونکہ امی جی کا بیان کردہ حلیہ سو فیصد درست تھا۔اس خواب کے تھوڑا عرصہ بعد دادا جی کی دی ہوئی نقدی کے نتیجہ میں ہماری بڑی بہن آپی پیدا ہوئی۔

دادا جی کو پرانی طرز کا گایا ہوا ایک گیت بہت پسند تھا۔شاید انہیں دنوں میں اس گیت کا پہلا ریکارڈ ریلیز ہوا ہو۔’’ڈاچی والیا موڑ مہار وے!‘‘۔مگر صحرا کی وسعتوں میں بڑھتے چلے جانے والے مہاراں کہاں موڑتے ہیں۔دادا جی گڑھی اختیار خاں سے چند کوس کے فاصلے پر تھے مگر وہ بھی پھر خانپور سے ڈاچی کی مہار موڑ کر گڑھی کی طرف کبھی نہیں گئے۔

ابا جی بتاتے تھے: دادا جی آخری ایام میں معمولی سا علیل ہوئے پھر ٹھیک ہو گئے۔ان دنوں میں ابا جی انہیں رات کو دیر تک دباتے رہتے اور جب تک دادا جی خود نہ کہتے کہ بیٹا بس کرو، تب تک دباتے رہتے۔۔اُس رات اتفاق سے دادا جی گہری نیند سو گئے اور ابا جی اپنی دُھن میں ساری رات دادا جی کو دباتے رہے یہاں تک کہ فجر کی اذان ہو گئی۔تب دادا جی چونک کر بیدار ہوئے اور کہنے لگے غلام سرور! تم ساری رات دباتے رہے ہو۔۔پھر دعائیں دیتے ہوئے کہنے لگے اب بس کرو۔ابا جی وہاں سے اٹھ کر محلے کی مسجد میں نماز پڑھنے چلے گئے۔واپس آئے تو بابا جی نے کہا: غلام سرور! ابا فوت ہو گئے ہیں۔۔ڈاچی والے عرب اور چولستان کے صحراؤں سے بھی آگے کائنات کے وسیع تر صحرا کی طرف چلے گئے اور کتنے اطمینان و سکون کے ساتھ چلے گئے۔

بچپن میں میری خواہش ہوتی تھی کہ جلدی سے بڑا ہو کر ابو بن جاؤں اور اپنے بچوں کو ڈانٹا کروں۔اب میری خواہش ہے کہ بچوں کی شادیاں کر کے دادا بن جاؤں۔پھر دادا بن کر اپنے

پوتوں میں اپنے بچپن کو اور اپنے آپ میں اپنے دادا جی کو دیکھوں۔اپنے دادا جی کے بارے میں مجھے علم ہے کہ:

وہ بڑ
کب کا صحرا کے سینے میں گم ہو چکا ہے
مگر آج میں جانتا ہوں
وہ میری ہی تصویر تھا
میرا اوتار تھا
میرا چہرہ تھا وہ
میں نے خود اُس کو بھیجا تھا
اپنی طرف
اسے خود بلاتا ہوں اپنی طرف!

میری دادا بننے کی خواہش دراصل اپنے دادا جی کو بلانے کی خواہش ہے۔

ڈاچی والیا موڑ مہار وے!

مجھے یقین ہے ڈاچی والا میری آواز پر اس بار ضرور مہاراں موڑے گا۔کیونکہ یہ اسی کی اپنی آواز ہے۔

☆☆☆

مظلوم متشدّد

(ناناجی)

زندگی! دیکھ بجھتے ہوئے لوگ ہم
بزمِ جاں میں چمکتے رہے رات بھر

ناناجی بنیادی طور پر ایک محنتی، جفاکش اور سیلف میڈ انسان تھے۔اہلِ حدیث مسلک سے تعلق رکھتے تھے۔ عالم شباب میں ہی ناناجی نے اپنا مسلک تبدیل کرلیا تو ان کے دو بڑے بھائیوں نے ان پر شدید تشدد کیا۔کئی دن تک بھوکا پیاسا رکھا۔تشدد کے نتیجہ میں جب ناناجی بے ہوش ہوجاتے تو ان کے منہ میں گندہ پانی ڈالا جاتا۔ بڑے بھائیوں کے اس ظلم اور تشدد کے ردِعمل کے طور پر ناناجی کا مزاج بھی متشددانہ ہوگیا۔بعد میں انہوں نے اپنی اولاد پر سختی کی۔یوں تو ان کی ہر بیٹی، بیٹے نے حسبِ توفیق مار کھائی تاہم بیٹوں میں ماموں کوثر اور ماموں صادق اس مار کے زیادہ شکار ہوئے۔جبکہ بیٹیوں میں خالہ حبیبہ کو یہ سعادت نصیب ہوئی۔خالہ حبیبہ کو اس لحاظ سے اپنے سارے بہن بھائیوں پر فوقیت حاصل ہے کہ باقی سب کی مار پٹائی ایک طرف اور اکیلی خالہ حبیبہ کی پٹائی ایک طرف۔۔۔ایک دفعہ کسی معمولی سی بات پر ناناجی کو اتنا طیش آیا کہ خالہ حبیبہ کو باقاعدہ طور پر الٹا لٹکا دیا اور دیر تک لٹکائے رکھا۔خالہ حبیبہ پر جو تشدد ہوا اس کا نفسیاتی اثر ان کے مزاج پر پڑا۔ لہجے میں چڑچڑاہٹ، انتقام اور اذیت پسندی کے تمام اوصاف ان کی ذات میں جمع ہوگئے۔ چنانچہ اپنے پہلے بیٹے کو خالہ نے بچپن میں ہی مار مار کر نیم پاگل بنادیا۔ جب خالہ کو اس زیادتی کا احساس دلایا گیا تو پھر دوسرا انتہا پسندانہ ردِعمل سامنے آیا۔ باقی اولاد کو خالہ نے بے مہار چھوڑ دیا اور خود بعض رشتہ داروں پر اپنے مزاج کی کڑواہٹ

نچھاور کرنے لگیں۔ان رشتہ داروں نے شکایت کی تو میں نے انہیں کہا کہ ان ساری زیادتیوں کو ناناجی کی ’’عطا‘‘ سمجھ کر برداشت کرلیں۔

نانی جی اور ناناجی کی عمروں میں خاصا فرق تھا۔نانی جی ساری زندگی ناناجی کے شدید دباؤ میں رہیں اور ناناجی کی سخت گیری نے انہیں مزید نرم بنادیا۔وہ اپنا غصہ کسی پر بھی نہ اتار سکیں، خود میں گھلتی رہیں اور ۵۳ سال کی عمر میں ہی وفات پاگئیں۔زندگی بھر تو ناناجی کا تختۂ مشق بنی رہیں۔ بیماری کے آخری ایام میں بھی ناناجی نے ان کا علاج کہیں اور کرانے سے روک دیا اور اپنی حکمت کے مختلف نسخے اس وقت تک اُن پر آزماتے رہے جب تک وہ فوت نہ ہوگئیں۔وفات سے چند گھنٹے پہلے نانی جی نے ناناجی سے فرمائش کی کہ ریوڑیاں کھانے کو جی کرتا ہے۔ناناجی خود عمدہ قسم کی ریوڑیاں لے کر آئے اور اپنے ہاتھوں سے نانی جی کو کھلاتے رہے۔ناناجی جیسے سخت گیر شوہر کے ہاتھ سے اتنی محبت کے ساتھ ریوڑیاں کھانا نانی جی کے لئے ناقابل یقین خوشی تھی۔اس واقعہ کے چند گھنٹے بعد نانی جی کو نیند آگئی۔ممانی مجیدہ نے دیکھا کہ نانی جی بڑے سکون کی نیند سو رہی ہیں۔ ان کا ماتھا ٹھنکا۔آج کے دور کے انسان کو خواب میں بھی ایسا سکون کہاں نصیب ہوتا ہے۔ممانی مجیدہ نے امی جی کو بلایا اور پھر سارا گھر جمع ہوگیا۔نانی جی فوت ہوچکی تھیں۔۔میرا خیال ہے وہ ناناجی جیسے سخت گیر شوہر کی محبت سے حیرت زدہ ہوئیں اور پھر اسی حیرت اور بے انتہا خوشی کے نتیجہ میں فوت ہوگئیں۔

ناناجی کی سخت گیری کا ایک تاریخی واقعہ میرے ساتھ بھی رونما ہوا۔ میں دس گیارہ سال کا تھا۔ مجھے پندرہ سیر گندم آٹے کی چکی سے پسوانے کے لئے دی گئی۔چکی والے نے گندم رکھ لی اور کہا کل آکر لے جانا۔مجھ سے غلطی یہ ہوئی کہ گھر والوں کو بتائے بغیر ساتھ کی گراؤنڈ میں کھیلنے چلا گیا۔گھر میں غالباً آٹا ختم تھا اس لئے میرا انتظار ہو رہا تھا۔گھر آیا تو ڈانٹ پڑی لیکن میری وضاحت سے سب کی تسلّی ہوگئی۔بدقسمتی سے اس وقت ناناجی موجود نہیں تھے رات کو جب ناناجی گھر آئے میں سو چکا تھا۔صبح سویرے مجھے ناناجی نے جگایا اور پوچھا رات آٹا کیوں نہیں لائے؟ میں نے تسلّی بخش جواب دے دیا۔اب انہوں نے پوچھا پسوائی کی چوّنی کہاں ہے؟۔ایک تو

نیند کا خمار، پھر صبح کا ملگجا سماں۔۔ جیب میں دیکھا تو چوّنی نہیں تھی۔ نانا جی کے ہاتھ میں بڑے سائز کا ایک درویشی عصا رہتا تھا۔بس اسی سے میری مرمت شروع کر دی۔اس دن نانا جی کے سونٹے سے مجھے اندازہ ہوا کہ ''موسوی عصا'' میں کتنی طاقت ہوتی ہوگی۔امی جی میں تو ہمت نہیں تھی کہ مجھے چھڑاتیں۔اتفاق سے ممانی مجیدہ نے میرے بستر کو چیک کیا تو وہاں سے چونی مل گئی۔ ممانی مجیدہ جیسی مظلوم عورت میں اس دن نجانے کہاں سے اتنی ہمت آ گئی۔میرے اور نانا جی کے بیچ آ کر ان کا عصا پکڑ لیا۔ یہ بہت بڑی جسارت تھی۔ چڑیا کا شہباز پر جھپٹنا تھا۔''یہ لیں اپنی چونی۔۔اس کے بستر پر گری پڑی تھی۔۔ناحق بچے کی اتنی دھنائی کر دی''۔اس دن ممانی مجیدہ کی ایسی محبت مجھ پر منکشف ہوئی جس کا عشر عشیر بھی پھر کسی ممانی کہ ہاں نظر نہیں آیا۔اس دن چڑیا، شہباز سے جیت گئی تھی۔نانا جی ڈھیلے پڑ گئے۔

ان واقعات سے یہ بھی نہ سمجھ لیں کہ نانا جی کوئی ''ہلاکو خاں'' قسم کی چیز تھے۔ان میں بلا کی ذہانت اور حسّ مزاح تھی۔ میرے بابا جی اور ابا جی کی ساری خوبیوں اور خامیوں کو اگر جمع کر دیا جائے تو نانا جی بن جائیں گے۔تنگ دستی کی حالت میں بھی بچوں کی بنیادی ضروریات کا پورا خیال رکھتے۔گرمیوں میں شربت کی بوتلیں اور سردیوں میں وسیع پیمانے پر پنجیری تیار کراتے۔ دونوں موسموں میں یہ چیزیں بچوں کو باقاعدگی سے فراہم کی جاتیں۔نانا جی کی اپنی خوراک بہت کم تھی لیکن شرط لگائی تو ایک دفعہ دس کلو گوشت کھا گئے اور ایک دفعہ گنے کے رس کی پوری بالٹی پی گئے۔ شادی بیاہ کی تقریبات پر نانا جی کے اندر کا ''میاں سراجدین'' باہر آ جاتا۔ اپنی اولاد، دامادوں، پوتوں، پوتیوں، نواسوں نواسیوں، سب کے ساتھ مل کر بیٹھتے۔سب سے گانے سنتے۔ خود بھی پنجابی کے لوک گیت بڑے اچھے ترنم کے ساتھ سناتے۔ جوں جوں بڑھاپا بڑھتا گیا نانا جی کی کرختگی ختم ہوتی گئی اور حسِ مزاح نمایاں ہوتی گئی۔ نانی جی کی وفات کے بعد نانا جی نے لگ بھگ ۲۰ سال زندگی گزاری۔ دوسری شادی کا نام لیا جاتا تو پہلے ایک گالی دیتے پھر ہنس پڑتے۔ کہتے اگر میں اس عمر میں بھی شادی کر لوں تو تمہارا ایک اور ماموں پیدا ہو سکتا ہے۔اس پر میں شرارت سے کہتا کہ نانا جی یہ خطرہ مول لینے والی بات ہوگی۔ اگر نیا ماموں، ماموں کوثر جیسا

پیدا ہو گیا تو پھر کیا بنے گا؟ اس پر مزید موج میں آ جاتے۔۔نانا جی نہانے سے سخت پرہیز کرتے تھے۔صرف عید کے عید نہاتے۔ایک دفعہ مجھے کہنے لگے نلکا چلاؤ میں نے وضو کرنا ہے۔نانا جی نے صرف چادر اور واسکٹ نما پھتوئی پہنی ہوئی تھی۔ میں نے نلکا چلانا روک کر کہا نانا جی! نہا کیوں نہیں لیتے؟۔۔سر اٹھا کر میری طرف مسکرا کر دیکھا اور کہنے لگے:

''بیٹے! جب سے تمہاری نانی مری ہے مجھے نہانے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی۔چلو تم نلکا چلاؤ اور وضو کراؤ''

نانا جی کی ذہانت نے انہیں اپنے زمانے کا جیمز بانڈ بنا دیا تھا۔اہلِ حدیث تھے تو اہلِ تشیع کی جاسوسی کے لئے کچھ عرصہ ذاکر بنے رہے۔اہلِ حدیث مسلک ترک کیا تو پھر کچھ عرصہ کے لئے بتّوں میں ''الّووَں والا پیر'' بنے رہے۔ قیام پاکستان کے بعد نانا جی اور نانی جی ہندوستان میں ہی رہے۔وہاں ان پر پاکستان کا جاسوس ہونے کا شبہ کیا جاتا رہا۔رہی سہی کسر میں نے پوری کر دی۔ میں غالباً پانچ سال کا تھا جب امی جی ہمیں لے کر نانا جی سے ملنے ہندوستان گئیں۔وہاں میں نے پاکستانی طریق کار کے مطابق بہت سارے بچوں کو جمع کیا۔ انہیں ایک قطار میں کھڑا کیا اور ہدایت کی کہ سب بچے اپنے سے اگلے بچے کی قمیص کا پیچھے کا حصہ اپنے ہاتھوں میں پکڑ لیں۔ میں خود سب سے آگے تھا۔ یہ ایک طرح کی گاڑی بن گئی تھی جس کا انجن، ڈرائیور اور گارڈ بھی میں ہی تھا۔ میں نے بچوں کو چند ہدایات دیں اور پھر ہماری گاڑی چلنے لگی۔ یہ گاڑی چھک چھک کے نعرے لگانے کے بجائے ''پاکستان زندہ باد۔۔ ہندوستان مردہ باد'' کے نعرے لگا رہی تھی۔ حالانکہ مجھے اس وقت ان لفظوں کے مفہوم کا بھی پتہ نہیں تھا۔ میری دانست میں یہ صرف ایک کھیل تھا۔ نانا جی کو علم ہوا تو نہایت بدحواسی کے عالم میں مجھے گود میں اٹھا کر گھر لے گئے۔امی جی کی گود میں پٹخ کر پتہ نہیں کیا کچھ کہا۔البتہ اتنا یاد ہے کہ نانا جی کو سچ مچ دو دن بخار چڑھا رہا۔ یہ غالباً ۱۹۵۷ء کی بات ہے۔اس کے بعد نانا جی بھی جلد پاکستان آ گئے۔

نانا جی نے عملی زندگی میں ہر طرح کی محنت کی۔مسجد کے موذن رہے۔ چارپائیاں بُننے کا کام بھی کیا۔منیاری کا کام بھی کیا (منیاری سے مراد صرف گوٹہ کناری کی فروخت سمجھیں) حکمت

کا کام بھی کرتے رہے۔ یہ کام عمر کے آخری حصے تک کرتے رہے اور اس سے انہیں اتنی آمدنی ہو جاتی تھی کہ گویا کسی کے محتاج نہیں تھے۔ نانا جی کے بعض نسخے میں نے ان سے ان کی زندگی میں ہی لئے تھے۔ بعض حسّاس قسم کے نسخے ان کی وفات کے بعد ان کی کاپی سے نوٹ کئے۔ انہوں نے اپنی دوائیوں کے نام بھی خود ہی بنا رکھے تھے مثلاً قبض کشا گولیوں کا نام تھا ''پیٹ کا جھاڑو''۔ اسی طرح مردانہ کمزوری کے ایک نسخے کا نام ''ایٹم بم'' تھا اور دوسرے نسخے کا نام تھا ''ہائیڈروجن بم۔۔عرف مردہ کو زندہ کرنا''۔ امرت دھارا ایک ایسی دوا ہے جو نزلہ، زکام، ہیضہ، قے، سردرد، دانت کے درد، کان کے درد، غرض بیسیوں بیماریوں کا فوری علاج ہے۔ کسی ہنگامی صورتحال میں پریشانی سے بچنے کے لئے یہ دوا ہر گھر میں ہونی چاہیے۔ آجکل Vicks اور بام کی صورت میں بھی امرت دھارا کو محدود استعمال کی چیز بنایا جا رہا ہے۔ اصل امرت دھارا گھر پر ہی پچیس تیس روپے میں تیار کیا جا سکتا ہے۔ افادۂ عام کے لئے یہ نسخہ پوری گارنٹی کے ساتھ پیش ہے۔ ست اجوائن، ست سنڈھ، ست دارچینی، ست الائچی، ست پودینہ۔۔ یہ پانچوں ست ایک ایک تولہ لے کر بوتل میں ڈالتے جائیں۔ ان کے ساتھ پانچ تولہ مشک کافور ملا دیں۔ ساری اشیا باہم ملنے پر خود بخود سیّال صورت اختیار کر لیں گی۔ یہ نسخہ میرا آزمودہ ہے۔۔۔۔۔ ایٹم بم کا نسخہ بغیر گارنٹی کے پیش ہے۔ مستگی رومی ایک تولہ، دودھ بڑ ایک تولہ، شنگرف رومی ایک ماشہ، انڈے کی زردی ایک عدد، افیون تین ماشے، سم الفار ایک ماشہ، تمام چیزوں کو کونڈی میں ڈال کر خوب رگڑیں۔ چنے کے برابر گولی بنائیں۔ ایک گولی کے ساتھ ایک چھٹانک دیسی گھی یا آدھ کلو دودھ لیں۔ فراغت کے لئے نمک چاٹنا ضروری ہے۔ اس نسخے کو آزمانے والے اپنی ذمہ داری پر آزمائیں البتہ گولیاں مفید ثابت ہوں تو مجھے بھی پندرہ بیس گولیاں ضرور بھیج دیں۔

نانا جی سے میں نے ایک دفعہ کہا تھا کہ دیسی طریق علاج کو ہمارے پرانے حکماء نے سب سے زیادہ نقصان پہنچایا ہے کیونکہ انہوں نے بیشتر نسخے اپنے سینوں میں بند رکھے اور اپنے ساتھ ہی قبروں میں لے گئے۔ نانا جی نے شکستہ دلی سے میرے موقف کو مان لیا تھا۔

نانا جی پر ان کے جو بھائی اور عزیز تشدد کرتے تھے، ساتھ یہ بھی کہتے تھے کہ اس بد بخت کو مار کر

اس کا بیج ہی ختم کر دو۔ قدرت خدا کی ان لوگوں کی اپنی نسلیں ختم ہو گئیں۔ نانا جی نے اپنے پوتے، پوتیاں، نواسے، نواسیاں ہی نہیں ان کی اولادیں بھی دیکھیں۔ رضوانہ کو شروع میں ہم روزی کہتے تھے نانا جی نے ایک سال کی اپنی پڑنواسی کو گود میں لیا۔ اتفاق سے بچی کو فراک بھی گلابی پہنا رکھی تھی۔ نانا جی نے بچی کا نام پوچھا۔ روزی کا لفظ سن کر مسکرائے اور کہنے لگے یہ تو ''مس گلابو'' ہے۔ گویا روزی کا پنجابی میں عمدہ ترجمہ کر دیا۔ نانا جی سے کبھی ہم پوچھتے کہ نانا جی آپ کہاں تک پڑھے ہیں؟ پنجابی لہجے میں اس طرح کہتے ''اینویں پاس ہوں'' جیسے کہہ رہے ہوں ''ایم۔اے پاس ہوں''۔

نانی جی کی وفات کے بعد تقریباً بیس سال نانا جی نے اکلاپے کی زندگی بسر کی۔ بیٹے، بیٹیاں اور ان کی اولادیں ہونے کے باوجود شریک زندگی کے بغیر بڑھاپا بسر کرنا خاصا کٹھن کام ہے۔ آخر آخر تک تو نانا جی اتنے نرم مزاج اور گداز طبیعت کے مالک ہو گئے کہ ان کے رویے پر حیرت ہوتی تھی اپنی زندگی کے ۸۶ سال پورے کر چکے تھے۔ بڑھاپے کی کمزوری آڑے آ رہی تھی۔ ایک دن نانا جی نے بڑی بہو سے کہا: مجھے ریوڑیاں منگا دو، سارے عزیز چونک اٹھے۔ نانی جی نے بھی وفات سے پہلے ریوڑیاں کھانے کی خواہش کی تھی۔ تو کیا نانا جی بھی۔۔؟۔۔۔سب کے دل میں خدشات گھر کر رہے تھے۔

ریوڑیاں منگائی گئیں۔ نانا جی کمزوری کے باوجود مزے لے لے کر ریوڑیاں کھاتے رہے اور پھر سو گئے۔

ہمارے اکثر خدشات ہمارے وہم کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ نانا جی کے بارے میں ہمارے خدشات بھی دراصل ہمارے وہم کا نتیجہ تھے۔

اس کے باوجود خدشات درست نکلے، وہم سچ ثابت ہوا۔

نانا جی فوت ہو چکے تھے۔

کبھی کبھی ہمارے وہم کتنے سچ ثابت ہوتے ہیں!

☆☆☆

مصری کی مٹھاس اور کالی مرچ کا ذائقہ

(تایاجی)

نظر سے دور ہے لیکن نظر میں ہے پھر بھی
کہ عکس اپنے مرے آئنوں میں چھوڑ گیا

اباجی کے بھائی ۔۔جنہیں ہم سب باباجی کہتے تھے، اباجی سے عمر میں بڑے تھے۔ اباجی نے زندگی ایک مقالہ نگار کی طرح بسر کی تو باباجی نے انشائیہ نگار کی طرح زندگی گزاری۔ وہ صراطِ مستقیم کی صداقت کے قائل تھے مگر ٹیڑھی میڑھی اور اونچی نیچی پگڈنڈیوں پر چلنا اور ارد گرد بکھرے ہوئے رنگوں اور خوشبوؤں سے لطف اٹھانا انہیں پسند تھا۔ باباجی نے بھرپور جوانی بسر کی۔ اباجی اور باباجی دونوں ایک دوسرے کے نیگیٹو تھے۔ اباجی کے مزاج کے برعکس باباجی خواتین کی محفلوں میں بیٹھ کر ہمیشہ خوش ہوتے۔ نماز کے قریب نہیں پھٹکتے تھے۔ کبھی زور لگا کر فجر کی نماز پڑھا دی تو سارا دن بہانے بنا بنا کر لڑتے۔ جمعہ کا دن آتا تو صبح سویرے ہی ان کی طبیعت خراب ہو جاتی اور عید کے موقعوں پر تو احتیاطاً ایک دن پہلے ہی بیمار ہو جاتے۔ روزوں کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ ایک دفعہ میں نے انہیں کہا: ''باباجی تین دن بعد رمضان شریف کے روزے شروع ہو رہے ہیں'' باباجی میری شرارت کو بھانپ گئے۔ پورے اعتماد کے ساتھ بولے: ''ہاں بھئی۔۔ اللہ کے نیک بندے روزے رکھیں گے۔ ہم تو بڑے گنہگار ہیں''۔۔ ایک آدھ دفعہ انہیں مجبور کر کے روزہ رکھوا دیا گیا تو عصر کے وقت ہی افطاری کے سارے لوازمات سجا کر بیٹھ گئے۔ کچھ دیر بعد بولے: ''آج دن کی رفتار خاصی سست ہے''۔ کسی نے مذاقاً کہہ

دیا: ''آج دن کو بھی پتہ ہے کہ باباجی نے روزہ رکھا ہوا ہے اسی لئے سلوموشن میں چل رہا ہے''۔ باباجی کا پارہ چڑھ گیا۔ مؤذن کے بارے میں گرم ہونے لگ گئے وہ بھی کہیں سو گیا ہے یا مر گیا ہے۔ دراصل روزے کے معاملے میں باباجی غالب کے ہم خیال تھے ؎

روزہ مرا ایمان ہے غالبؔ لیکن   خس خانہ و برفاب کہاں سے لاؤں

باباجی کے ''خس خانہ و برفاب'' سے مراد ''روزہ رکھنے کا حوصلہ'' ہے۔ اس کے باوجود باباجی خدا کی بے پایاں رحمت اور اپنے آقا حضرت محمد ﷺ کی شفاعت پر کامل ایمان رکھتے تھے۔ سیدھے سادے مسلمان تھے۔ کبھی کبھی موج میں ہوتے تو کہتے: ہم خدا کی اپنی بنائی ہوئی مخلوق ہیں۔ ہماری ساری غلطیاں اور گناہ وہ بخش دے گا۔ ویسے بھی کون ہے جو محض اپنی نیکیوں اور عبادتوں کے بل پر اپنی بخشش ہو جانے کا دعویٰ کرتا ہے۔ قوالی سننے کے رسیا تھے۔ عزیز میاں اور صابری برادران کی قوالیاں سن کر باقاعدہ جھومنے لگتے۔

آزادہ روی باباجی کے مزاج میں بچپن سے ہی تھی۔ داداجی نے انہیں سکول میں داخل کرایا۔ پہلے دن ہی قاعدہ اور تختی کنویں میں پھینک آئے۔ داداجی نے تین دفعہ قاعدہ لے کر دیا۔۔ باباجی تینوں دفعہ کنویں میں پھینک آئے۔ آخر داداجی نے حقائق کو تسلیم کر لیا اور باباجی کو پڑھائی میں الجھانے کی کوشش ترک کر دی۔

باباجی ہمارے اباجی سے عمر میں پندرہ سال بڑے تھے۔ اباجی جب پرائمری سکول میں پڑھنے جاتے تو واپسی پر ایک درخت کے نیچے لیٹ کر سو جاتے۔ باباجی باقاعدگی سے اباجی کو گود میں اٹھا کر گھر لاتے۔ بڑے بھائی ہونے کے ناطے باباجی احترام کے لائق تھے مگر ہم نے جب سے ہوش سنبھالا یہی دیکھا کہ باباجی ہمارے اباجی کا ایسے احترام کرتے جیسے سعادت مند چھوٹے بھائی اپنے بڑے بھائی کا احترام کرتے ہیں۔ اباجی جب پینتالیس سال کے تھے باباجی ساٹھ سال کے تھے۔ اباجی پچاس سال کے ہوئے باباجی ساٹھ سال کے رہے۔ اباجی چونسٹھ سال کی عمر میں وفات پا گئے۔ باباجی پھر بھی ساٹھ سال سے آگے بڑھنے کو تیار نہ تھے۔ ہم نے منت سماجت کی تو بمشکل پینسٹھ سال کے ہوئے اور پھر جب بیاسی سال کی عمر میں فوت ہوئے تب بھی پینسٹھ

سال کے تھے۔دراصل باباجی کو گزرتی ہوئی عمر کو روکنے کا ہنر آتا تھا۔مرتے دم تک باباجی نے ورزش کو ہی اپنی عبادت بنائے رکھا اور اس ورزش کی برکت سے بیاسی سال کی عمر تک بالکل ہشاش بشاش رہے۔

باباجی کو پہلوانی کا شوق تھا، خانپور کے علاقہ میں اپنے زمانے میں اچھے پہلوان مانے جاتے تھے۔عمر ڈھل گئی تو انہوں نے شاگرد پالنے شروع کر دیئے۔کشتی کے داؤ پیچ سکھانے میں باباجی ماہر تھے۔''استاد جی'' کہلوا کر خوش ہوتے۔جہاں بھی رہے اپنے شاگردوں کا حلقہ پیدا کیا۔جب وہ انہیں ''استاد جی'' کہہ کر پکارتے تو بے حد خوش ہوتے۔ہم پانچ بھائی ہیں اور پانچوں فری اسٹائل ریسلنگ دیکھنے کے شوقین۔ہم بھائی جب بھی اکٹھے ہوتے تھے ہماری اہم ترین مصروفیت ریسلنگ کی تازہ ترین فلمیں دیکھنا اور پرانی کشتیوں پر تبصرہ کرنا ہوتی تھی۔ہم ہوگن، اینڈ ردی جائنٹ، میچومین، کمالا، رِک فلئیر، روڈی پائپر جیسے پہلوانوں کی باتیں کرتے تو باباجی کو شدید غصہ آتا۔فری اسٹائل کشتی کے فن کو صلواتیں سناتے اور پھر دیسی کشتی کے محاسن اور فضائل پر طویل لیکچر دے ڈالتے۔باباجی بلب کے مقابلے میں تیل کے چراغ، فرج کے مقابلے میں گھڑے اور نئے دور کے مقابلے میں پرانی روایات کو ترجیح دیتے تھے۔انہوں نے ہزار بحثوں کے بعد بھی زمانے کے ارتقاء کا اعتراف کرنے سے ہمیشہ انکار کیا۔

اباجی اور باباجی دو بھائی تھے۔اس خاندان میں پچھلی کئی پشتوں سے یہ ہو رہا تھا کہ دو بیٹے پیدا ہوتے، ایک اولاد سے محروم رہتا اور ایک کے ہاں پھر دو بیٹے ہو جاتے۔۔چنانچہ باباجی بھی اولاد کی نعمت سے محروم رہے لیکن ان کی وفات کے ساتھ ہی ہمارے خاندان کی اس نسل در نسل روایت کا بھی خاتمہ ہو گیا۔شروع شروع میں باباجی کو اولاد سے محرومی کا قلق رہا پھر پتہ نہیں انہوں نے قسمت کے لکھے سے سمجھوتہ کر لیا یا انہیں اتنی بڑی کائنات میں انسان کی بے وقعتی کا احساس ہو گیا کیونکہ پھر انہوں نے زندگی سے مسرت کشید کرنے کا عمل تیز کر دیا۔

باباجی کی آنکھ میں موتیا اتر آیا۔آپریشن ہوا، کامیاب رہا مگر نظر مزید کمزور ہو گئی۔انہوں نے ٹی وی دیکھنا چھوڑ دیا۔ٹی وی دیکھنا چھوڑ کر بھی باباجی کے ''حُسنِ نظر'' میں کمی نہیں آئی۔جیسے

ہی ملکۂ ترنم نور جہاں کا کوئی نغمہ سنائی دیتا، نغمہ سننے اور ملکہ ترنم کی زیارت کے لئے ٹی وی والے کمرے میں آ جاتے۔نور جہاں کا نغمہ بڑی محویت سے سنتے بلکہ بڑی محویت سے دیکھتے۔ایک موقعہ پر تو عالمِ محویت میں ان کی عینک ہی گر گئی تھی۔۔پھر یوں ہوا کہ مسرت نذیر کا یک ٹی وی پر نمودار ہو گئی۔بچوں نے اپنی عمر سے آگے بڑھ کر جوان ہونا شروع کر دیا اور بوڑھوں نے ریورس گیئر میں جوان ہونا شروع کر دیا۔باباجی بھی مزید جوان ہو گئے۔مسرت نذیر کے گائیکی کے انداز نے باباجی کی توجہ کھینچ لی تھی۔اس کے باوجود باباجی نے ملکۂ ترنم نور جہاں سے تعلق خاطر کو ٹوٹنے نہیں دیا۔البتہ یہ تعلق کمزور ضرور پڑ گیا۔مثلاً ایک بقرعید پر ملکۂ ترنم کا نغمہ دکھایا گیا۔باباجی محبت کا بھرم رکھنے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے مگر ٹی وی والے کمرے تک پہنچتے پہنچتے اتنی دیر ہو گئی کہ گانا ختم ہو گیا اور باباجی الٹے پاؤں یوں لوٹ گئے جیسے ملکہ ترنم سے کہہ رہے ہوں: ''اچھا اگلی بقرعید پر سہی!''۔

ہمارے بچپن میں باباجی ایک دفعہ مجھے اور آپی کو اپنے اکھاڑے میں لے گئے۔ہم دوسری کشتیاں دیکھتے رہے لیکن جیسے ہی باباجی اکھاڑے میں اترے اور اپنے حریف سے پنجہ آزمائی کرنے لگے ہم نے یہ سمجھا کہ دوسرا آدمی ہمارے باباجی کو مارے گا۔چنانچہ ہم نے رونا اور چیخنا شروع کر دیا۔ہماری چیخ و پکار سے مجبور ہو کر باباجی کو کشتی ادھوری چھوڑنا پڑی۔آ کر ہمیں تسلّی دیتے رہے کہ میں اپنے حریف کو پچھاڑ دوں گا مگر ہم نے انہیں کشتی نہیں لڑنے دی۔

باباجی نے دو شادیاں کیں مگر دونوں ناکام ہوئیں۔بوا حیات خاتوں بتایا کرتی تھیں کہ پہلی بیوی کے ساتھ باباجی زیادتیاں کرتے تھے۔باباجی اس الزام پر ہمیشہ برہم ہو جاتے۔دوسری بیوی کا حال ہم نے خود دیکھا۔اس نے ہمیشہ باباجی کے ساتھ زیادتی کی۔باباجی جہاں تک برداشت کر سکتے تھے، کرتے رہے۔جب قوت برداشت جواب دے گئی تو علیٰحدگی ہو گئی۔ممکن ہے اولاد ہوتی تو باباجی کی قوّتِ برداشت بڑھ جاتی اور دونوں میں علیحدگی کی نوبت نہ آتی۔باباجی کی بیویوں نے باباجی کا ساتھ نہیں دیا تھا یا باباجی اپنے ساتھ نہیں نبھا پائے، یہ خدا ہی بہتر جانتا ہے۔مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ باباجی نے اباجی کا زندگی بھر ساتھ دیا۔۔بُرے وقتوں میں کام آئے،

بھلے وقتوں میں کام آئے۔ان کی جائیداد بے شک ان کی موت کے بعد ہمارے حصے میں ہی آتی مگر اپنی زندگی میں ہی اپنی جائیداد بھائی، بھتیجوں کے سپرد کر دینا بڑے حوصلے اور دل جگرے کا کام ہے۔ بابا جی نے یہ کام کیا۔ ہمارے ساتھ نیکی کی احسان کیا۔اس کا اجر انہیں خدا سے ملے گا۔

میرے بچوں سے بابا جی بہت مانوس تھے۔ رضوانہ، زلفی، شازی، ٹیپو، مانو پانچوں سے انہیں محبت تھی۔ بابا جی کالی مرچ، سونف، مصری، بادام اور الائچی وغیرہ کا وافر اسٹاک اپنے پاس رکھتے اور انہیں عام طور پر استعمال کرتے رہتے۔ بچوں کو مصری اور بادام دیا کرتے تھے۔ محلے کے بچوں میں بھی مصری بانٹا کرتے تھے۔ چنانچہ محلے میں ''مصری والے بابا'' کے نام سے مشہور ہو گئے۔

بابا جی صاف دل اور سادہ مزاج انسان تھے۔انہوں نے کبھی خود کو نیک اور متقی باور کرانے کی کوشش نہیں کی۔غصہ آتا تو پینے کی کوشش نہیں کرتے تھے، برملا اظہار کر دیتے تھے۔ چنانچہ آخری پانچ برسوں میں مہینے میں ایک آدھ بار جھگڑا ضرور کر لیتے۔ دراصل اپنی صاف دلی اور سادہ مزاجی کے باعث ''لائی لگ'' تھے۔ جھگڑا اُس وقت کرتے جب بعض رشتہ دار انہیں بھڑکاتے۔ جب جھگڑا کر چکتے پھر خود ہی بتا دیتے کہ مجھے فلاں فلاں نے اس طرح غصہ دلایا تھا۔ چنانچہ ہم کسی عزیز سے تلخی پیدا کئے بغیر فساد پھیلانے والے رشتہ داروں سے واقف ہو گئے اور خود ہی محتاط رہنے لگے، مگر بابا جی کا کمال یہ تھا کہ کچھ عرصہ ٹھنڈا رہنے کے بعد پھر انہیں رشتہ داروں کے ہاں آنے جانے لگتے۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھے

بابا جی کو مٹی سے بڑی محبت تھی۔ شروع شروع میں گھر کے کچے صحن میں آلتی پالتی مار کے بیٹھے رہتے۔ پھر گھر کے باہر بھی اسی طرح بیٹھنے لگے، بلکہ بعض دفعہ خاک پر نیم دراز ہو جاتے۔ میں نے ان سے ایک دوبار مؤدبانہ درخواست کی کہ اس طرح سرِ راہ نہ بیٹھا کریں۔ان کا جواب تھا مجھے مٹی سے محبت ہے، اس کی خوشبو اچھی لگتی ہے۔۔ میں نے گذارش کی کہ صحن کی مٹی کی خوشبو سے ہی محبت پوری کر لیجئے مگر وہ تو شاید ''تمنا'' کا دوسرا قدم ڈھونڈنے کے چکر میں تھے۔ آخر میں

نے انہیں اپنی اور ان کی قریشیت کا واسطہ دے کر کہا آپ جس طرح سرِ راہ مٹی سے اظہارِ محبت فرما رہے ہیں اس میں محبت کی بھی رسوائی ہے اور مجھے خدشہ ہے کہیں راہ گیر آپ کے سامنے پیسے نہ ڈالنے شروع کر دیں۔۔ میرا تیر ٹھیک نشانے پر بیٹھا اور بابا جی لاحول ولاقوۃ پڑھتے ہوئے ایک دم چھلانگ مار کر کھڑے ہو گئے۔اس کے بعد بابا جی گھر کے صحن میں ہی مٹی سے اظہارِ محبت کرتے رہے۔

دراصل بابا جی کے اندر ایک بڑا مضبوط دراوڑ موجود تھا۔مٹی سے جڑا ہوا، ماضی اور اس کی روایات سے چمٹا ہوا۔ ہم لوگ بابا جی کے لئے آریائی ثابت ہوئے کہ انہیں خانپور سے دھکیلتے ہوئے بالائی پنجاب تک لے آئے لیکن بابا جی کے من میں جو دنیا آباد تھی وہ ویسے ہی آباد رہی۔ خانپور چھوڑنے کے بعد وہ کیسٹ پلیئر پر اکثر یہ گانا سنا کرتے ''چل اُڑ جا رے پنچھی کہ اب یہ دیس ہوا بیگانہ''۔ گانا سن کر اداس ہو جاتے۔ مگر کیسٹ پلیئر کے مقابلے میں گراموفون مشین کی آواز انہیں زیادہ فطری لگتی رہی۔ وہ جدید ٹیکنالوجی سے کبھی مرعوب نہ ہوئے۔ حالانکہ گراموفون مشین اسی جدید ٹیکنالوجی کی ابتدائی صورت تھی، مگر میرا خیال ہے بابا جی اس معاملے کو کسی اور زاویے سے دیکھتے اور سوچتے تھے۔۔ کبھی کبھی ایسے لگتا ہے جیسے بابا جی نے جو دنیا اپنے من میں آباد کر رکھی تھی وہ دنیا تو میرے من میں بھی آباد ہے۔ اور اب تو بابا جی کی بہت سی ایسی باتیں بامعنی لگنے لگی ہیں جو ان کی زندگی میں بے معنی لگتی تھیں۔

بابا جی ایک اچھے دراوڑ کی طرح مٹی سے محبت بھی کرتے تھے اور موت سے خائف بھی رہتے تھے۔ موت کا کوئی قصّہ کبھی ہم لے بیٹھتے تو بابا جی ناراض ہو جاتے اور کہتے موضوع تبدیل کرو۔ ہم انہیں تنگ کرنے کے لئے کہتے بابا جی جب ہر کسی نے ایک نہ ایک دن مرنا ہے تو پھر موت سے ڈر کیسا۔۔ پہلے بابا جی کچھ گھبراتے پھر جی کڑا کر کے کہتے میں پہلوان ہوں آسانی سے جان نہیں دوں گا۔۔ لگتا ہے فرشتۂ اجل کو بھی بابا جی کے خوف پر رحم آ گیا ہو گا کیونکہ موت ان کی طرف ایسے آئی کہ نہ انہیں پتہ چل سکا، نہ ہمیں پتہ چل سکا۔ بازار سے گھوم پھر کر، اپنے شاگردوں سے مل کر آئے، گھر کے صحن سے برآمدے تک پہنچے اور چلتے چلتے ہی جان دیدی۔۔ میرے دادا جی

کے بڑے بیٹے قریشی غلام حسین ۔۔میرے اباجی کے بڑے بھائی، ہم سب کے تایاجی فوت ہو گئے ۔مصری کی مٹھاس اور کالی مرچ کا ذائقہ دونوں ایک ساتھ کھو گئے ۔

باباجی کی زندگی میں ہی میرا ایک افسانہ ''دھند کا سفر''۔ نگار پاکستان کراچی میں چھپا تھا۔ اس افسانے میں باباجی اور میرے تعلق سے ایک واقعہ بھی درج تھا جو افسانہ نہیں حقیقت ہے۔

وہ حقیقت اپنے افسانے سے نقل کرتا ہوں۔

(آپی اور میں)''جب ہم دونوں چار سال اور تین سال کے تھے، تایاجی ہمارے ہاں آئے تھے، پھر تھوڑی دیر کے لئے کہیں باہر چلے گئے تو آپی نے اور میں نے مشترکہ طور پر سوچا کہ ہمارے تایاجی گم ہو گئے ہیں اور پھر صلاح کی کہ ہم دونوں چل کر انہیں ڈھونڈتے ہیں۔ ہم بڑی خاموشی سے گھر سے نکل آئے۔قریبی بازار تک آئے پھر پتہ نہیں کیا ہوا، راستے گم ہونے لگے اور تایاجی کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے ہم خود گھر کا راستہ بھول گئے ۔نہ تایاجی ملے، نہ گھر کا راستہ۔سڑک کے کنارے کھڑے ہو کر ہم دونوں نے رونا شروع کر دیا۔کسی شریف دوکاندار نے ہمیں اپنی دوکان پر بٹھالیا اور ڈھیر ساری مٹھائی بھی ہمارے سامنے رکھ دی۔ہم نے مٹھائی کھانے کے ساتھ ساتھ رونے کا عمل بھی جاری رکھا تاوقتیکہ تایاجی اور اباجی ہمیں ڈھونڈتے ڈھونڈتے وہاں تک نہ آ گئے ۔تب ہم مارے خوشی کے باقی مٹھائی اٹھانا بھی بھول گئے''

اب جبکہ اباجی اور باباجی دونوں اس جہان میں نہیں رہے تو مجھے خود احتیاط کرنا پڑتی ہے کہ گھر سے زیادہ دور نہ نکل جاؤں اور گھر کا راستہ نہ بھول جاؤں کیونکہ اب اباجی اور باباجی میں سے کوئی بھی مجھے ڈھونڈنے نہیں آئے گا۔اب اچھے دوکاندار بھی بہت کم ہیں اور اغوا کرنے والے زیادہ۔اسی لئے مجھے ہر قدم سوچ سوچ کر اور پھونک پھونک کر اٹھانا ہے۔

مجھے یقین ہے مٹی سے محبت رکھنے والے باباجی، جو موت سے بھی ڈرتے تھے، اب موت کے بعد کسی خوف کے بغیر مٹی سے ہم آغوش ہو کر اپنی محبت کو کمال تک پہنچا رہے ہوں گے۔

☆☆☆

رانجھے کے ماموں

(ماموں ناصر)

ہر اسکتا نہ تھا ویسے تو کوئی بھی مگر مجھ کو
کسی کی کامیابی کے لئے ناکام ہونا تھا

میرے والد سرائیکی تھے سو میں نسلاً سرائیکی ہوں۔ میری والدہ پنجابی تھیں اس لحاظ سے سرائیکی النسل ہونے کے باوجود میری مادری زبان پنجابی ہے۔ پنجابی زبان میں ماں کا نام دوبار لینے سے ماموں کا رشتہ بنتا ہے یعنی ''ماں ماں''(لکھنے میں تو شاید ماماں سے ہی کام چل جاتا ہے لیکن الفاظ کی ادائیگی میں ماں ماں کہنا ہوتا ہے) سو ماموں کا رشتہ بڑا اہم اور معتبر رشتہ ہے۔میرے پانچ ماموں ہیں۔عمروں کے لحاظ سے ان کی ترتیب یوں ہے: پہلا نمبر عطاء اللہ کلیم صاحب۔دوسرا نمبر پروفیسر ناصر احمد صاحب۔تیسرا نمبر حمید اللہ کوثر باجوہ صاحب۔چوتھا نمبر ڈاکٹر سمیع اللہ ریاض صاحب۔پانچواں نمبر حبیب اللہ صادق صاحب۔اگر مجھ سے میری ذاتی پسند کے بارے میں پوچھا جائے تو پھر میرے ماموؤں کی ترتیب یوں ہوگی: پہلا نمبر ماموں ناصر۔دوسرا نمبر ماموں ناصر۔تیسرا نمبر ماموں ناصر۔چوتھا نمبر ماموں سمیع اور پانچواں نمبر ماموں صادق۔

یہ قطعاً میری ذاتی پسند کی ترتیب ہے جس سے اختلاف کا ہر عزیز کو حق حاصل ہے۔اس ترتیب سے یہ ظاہر ہو رہا ہے کہ ماموں ناصر میرے لئے ایسے ماموں ہیں جو ماں کا نام دوبار لینے سے نہیں بلکہ چھ بار لینے سے پورے ہوتے ہیں اس سے میرے لئے ان کی محبت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔لیکن ماموں ناصر کی محبت بڑی ظالم شے ہے اس کی وضاحت ذرا آگے چل

کر ہو گی۔

ماموں ناصر کے ساتھ میری محبت دراصل ''بچپن کی محبت'' ہے میں نے ابتدائی عمر میں ہی دیکھا کہ ماموں ناصر کو اپنی بہنوں میں میری امی جی سے خاص محبت تھی۔ اتنی خاص کہ دوسری بہنوں کے لئے بھی بعض اوقات غصے کا موجب بن جاتی۔ بے جی (نانی جان) بھی کبھی کبھی جھلا جاتیں۔ امی جی کے تعلق سے یہ محبت ابا جی تک بھی پہنچی ماموں ناصر ابا جی کا بے حد احترام کرتے۔ رحیم یار خان میں تنگی کے دنوں میں جب بھی ماموں ناصر سے قرض مانگا انہوں نے فوراً فراہم کیا، چاہے خود بھی کہیں سے قرض ہی کیوں نہ لیا ہو لیکن ابا جی کے کام میں تاخیر نہیں ہونے دی۔۔ ایک موقعہ پر بہت سارے عزیز و اقارب جمع تھے۔ ابا جی اپنے جوتوں کی مرمت اور پالش کرانے کے لئے کسی بچے کو ڈھونڈ رہے تھے۔ جب تک کوئی بچہ ملتا ماموں ناصر بتائے بنا خود ابا جی کے جوتے لے کر چلے گئے اور مرمت کرا کے، پالش کرا کے لے آئے۔۔ امی جی اور ابا جی کے ساتھ ماموں ناصر کے ایسے محبتی رویّے کی متعدد مثالیں ہیں۔ اسی وجہ سے بچپن میں ہی مجھے ماموں ناصر سے محبت ہو گئی۔ مبارکہ کے ساتھ میری شادی ہونے میں میری پسند کے علاوہ امی جی اور ماموں ناصر کی گہری محبت کا جذبہ بھی کارفرما تھا۔

ماموں ناصر بنیادی طور پر سیلف میڈ انسان ہیں کم عمری میں میٹرک کا امتحان پاس کرتے ہی انہوں نے سارے خاندان کا بوجھ اٹھانے کے لئے نوکری کر لی۔ نوکری کے ساتھ پرائیویٹ طور پر تعلیم کے حصول کا سلسلہ جاری رکھا۔ ریلوے کی ملازمت سے لے کر انگلش کی پروفیسری تک انہوں نے ان تھک محنت کی۔ خاندان کے تقریباً ہر فرد پر احسانات کئے اور تقریباً ہر فرد سے ان احسانات کی مناسب سزا پائی۔ ماموں ناصر کی ایک خوبی یہ ہے کہ اپنوں میں سے جو انہیں زیادہ عزیز ہوتے ہیں ان کی سفارش پر دوسروں کے مشکل کام کروا دیتے ہیں مگر خود اس عزیز کا کام کبھی نہیں کرائیں گے جس سے انہیں محبت ہو گی۔ اس لئے میں نے کہا تھا کہ ماموں ناصر کی محبت بڑی ظالم شے ہے اور اس محبت کے بڑے شکاروں میں سے ایک میں ہوں۔

ماموں جی کی پہلی شادی ماں کی اطاعت میں ہوئی اس خاندانی فیصلے کی قیمت ممانی مجیدہ

نے ادا کی۔ سرخ و سفید رنگت والی ممانی مجیدہ سے لے کر ٹی بی کا شکار ممانی مجیدہ تک دکھوں کا ایک سفر تھا۔ ممانی مجیدہ نے ۳۲ برس کی عمر میں یہ سفر طے کر لیا اور اپنی یادگار ایک بیٹا اور تین بیٹیاں چھوڑ گئیں۔

میری شادی اپریل ۱۹۷۱ء میں ہوئی اسی سال میں اور مبارکہ گرمیوں کے دنوں میں ماموں ناصر کے پاس مانسہرہ گئے۔ وہاں ایک دن ریڈیو پر مہندر کپور کا گیت نشر ہوا:

تم اگر ساتھ دینے کا وعدہ کرو میں یونہی مست نغمے لٹاتا رہوں

میں نے دیکھا ماموں ناصر عالم جذب میں پہنچے ہوئے تھے۔ ممانی مجیدہ کو فوت ہوئے چار برس ہو چکے تھے اور ان کی زندگی کے آخری تین برس بھی سنگین بیماری کے باعث شجر ممنوعہ کے طور پر بسر ہوئے تھے۔ گویا سات برس کا وقفہ تھا۔ بیٹیوں کی شادی کے بعد جیسے ہی انہیں سبکساری کا احساس ہوا زندگی پھر سے انگڑائیاں لینے لگی۔ مہندر کپور گا رہا تھا:

میں اکیلا بہت دیر چلتا رہا
اب سفر زندگانی کا کٹتا نہیں
جب تلک کوئی رنگیں سہارا نہ ہو
وقت کافر جوانی کا کٹتا نہیں

میں نے اس دن مہندر کپور کے گیت کا لفظ لفظ ماموں ناصر کے روم روم میں اترتے دیکھا۔

خانپور واپس آ کر امی جی کو اپنے ''مشاہدہ'' کا حال سنایا۔ امی جی نے فوراً رشتوں کی تلاش شروع کر دی۔ دو سال کی دوڑ دھوپ کے بعد مطلوبہ رشتہ ملا۔ چندے آفتاب چندے ماہتاب۔۔ ممانی آصفہ کو ملتان سے بیاہ کر خانپور لایا گیا۔ دو چار دن شادی کی گہما گہمی رہی پھر ماموں، ممانی پشاور چلے گئے۔ گھر آباد ہو گیا۔

ماموں ناصر انگریزی ادبیات کے استاد ہیں مگر اُردو ادب سے بے خبر نہیں ہیں اردو کے کلاسیکی ادب سے تو گہری واقفیت رکھتے ہیں۔ برجستہ اشعار پڑھنے میں انہیں ملکہ حاصل ہے۔ ایک دفعہ مرحومہ ممانی مجیدہ نے کہا کہ مجھے تھوڑا اسا دبا دیں۔ فوراً غالب کا یہ شعر پڑھنے لگے:

اسدخوشی سے مرے ہاتھ پاؤں پھول گئے
کہاجواس نے، ذرامیرے پاؤں داب تو دے

ہزارہ میں ڈاڈر کے علاقے سے دریائے سرّن گزرتا ہے۔ دریا کا صاف پانی اور چاروں طرف ہریالی۔۔ میں اس منظر کو حیرت اور مسرت سے دیکھ رہا تھا کہ ماموں ناصر نے معمولی سے تصرف کے ساتھ علامہ اقبال کے یہ اشعار پڑھنا شروع کر دیئے:

صف باندھے دونوں جانب بوٹے ہرے ہرے ہیں
ندی کا صاف پانی تصویر لے رہا ہے
ہے دلفریب ایسا کہسار کا نظارہ
پانی بھی موج بن کر اٹھ اٹھ کے دیکھتا ہے
پانی کو چھو رہی ہے جھک جھک کے گل کی ٹہنی
جیسے حسین کوئی آئینہ دیکھتا ہے

دل کی ایسی جادوئی حالت تھی جیسے علامہ اقبال کے اشعار الہام کی طرح نازل ہو رہے ہوں یہ ماموں ناصر کی برجستگی کا کمال بھی تھا۔

گھر کی شادی بیاہ کی محفلوں میں جب صرف خاندان کے افراد موجود ہوتے ماموں ناصر کوئی نہ کوئی غزل اپنے مخصوص ترنم کے ساتھ سناتے۔ بہادر شاہ ظفر کی غزل ''تا در جاناں ہمیں اول تو جانا ہے منع'' اور سراج دکنی کی غزل ''خبر تحیّر عشق سن نہ جنوں رہا نہ پری رہی''۔۔ ماموں ناصر ایسی خوبصورتی سے سناتے کہ یہ اصل شاعروں کی بجائے ماموں ناصر کا کلام لگنے لگا۔

طبعاً ماموں ناصر مذہبی انسان ہیں مگر مذہبی تعصّبات سے دور۔۔ حالانکہ میرے عزیزوں میں بعض ایسے لوگ بھی ہیں جو اپنے کٹڑ پن کے باعث اپنے تعصّبات سے پاک نہیں ہو سکے۔ یورپ اور امریکہ کا کشادہ ماحول بھی ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکا۔۔ مذہبی ہونے کے باوجود ماموں ناصر خلاف شرع تھوک لینے کو عیب نہیں سمجھتے اسی لئے اندھیرا، اجالا ان کا مسئلہ نہیں ہے۔۔ ماموں ناصر کی خوش ذوقی اور شگفتہ مزاجی کے باعث مجھے ہمیشہ ٹوہ رہی کہ ماموں ناصر کی کسی پرانی محبت کو

دریافت کروں اس میں کوئی واضح کامیابی تو نہیں ہوئی لیکن اتنا سراضرور ہاتھ آیا ہے کہ کسی زمانے میں ماموں ناصر کی فیصل آباد کے ایک میر صاحب سے بہت دوستی تھی۔ ان کی بیگم، بہن، بچے۔۔ گھر کے سب افراد ماموں ناصر کے لئے چشم براہ رہتے۔ انہیں دیکھ کر ماموں ناصر کے چہرے پر بھی شگفتگی پھیل جاتی۔ بعد میں یکا یک یہ تعلق ٹوٹ گیا۔ میرا اندازہ ہے کہ ماموں ناصر کی موجودہ شگفتہ مزاجی اسی دور کی عطا ہے۔ واللہ اعلم باا لصواب!

مجھے شاعری کا شوق ہوا تو ماموں ناصر نے میری اصلاح کے لئے ایک استاد قسم کے شاعر جناب اختر بےخودرام پوری (یا کوئی اور پوری) کو بلالیا۔ انہوں نے میری وہ اصلاح فرمائی کہ شاعری سے تائب ہونے میں بس تھوڑی سی کسر رہ گئی۔ عام زندگی میں مجھے راہ راست پر لانے کے لئے ماموں ناصر کسی نہ کسی جناب اختر بےخودرام پوری کو مجھ پر مسلّط کر دیتے ہیں۔ شاید انہیں میری اصلاح کا گر معلوم ہو گیا ہے۔

ہر انسان کی زندگی عام معمولات کے مطابق بسر ہوتی ہے لیکن ایک ڈگر پر چلتے چلتے اس میں کبھی کبھار کوئی موڑ بھی آ جاتا ہے۔ کوئی پراسرار، محیرالعقول یا روحانی تجربہ یا پھر کوئی ایسا واقعہ، سانحہ ہو جاتا ہے جس سے زندگی عام ڈگر سے ہٹ جاتی ہے۔ ماموں ناصر کی زندگی میں بعض ایسے واقعات رونما ہوئے۔ قیام پاکستان کے ایّام میں مشرقی پنجاب میں بم کے ایک دھماکے کے نتیجہ میں ماموں ناصر زخمی ہو گئے۔ موت انہیں چھو کر گزر گئی۔ بم کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے کی ضرب کا نشان ماموں ناصر کے جسم پر آج بھی موجود ہے۔ اس تجربے سے انہیں زندگی کی اہمیت اور موت کی حقیقت دونوں کا ادراک ہوا۔

ریلوے ملازمت کے دوران ماموں ناصر غالباً کوہاٹ میں مقیم تھے۔ وہاں ایک دفعہ موسم بہار میں ایک سانپ نکل آیا۔ ریلوے کے ایک دو ملازموں نے مل کر سانپ کو ہلاک کر دیا۔ ماموں ناصر کا قصور صرف اتنا تھا کہ وہ بھی جائے واردات پر تماشائی کی حیثیت سے موجود تھے۔ فلمی کہانیوں کے عین مطابق مردہ سانپ کی آنکھوں میں ماموں ناصر کا عکس بھی محفوظ ہو گیا۔ پھر اس سانپ کی مادہ کے انتقام کی سٹوری شروع ہو گئی ماموں ناصر سے اس ناگن نے عجیب انتقام

لیا۔ ہر سال بہار کے موسم میں آتی اور ان کے پیروں کو سونگھ کر چلی جاتی۔ اگلی صبح پاؤں اس طرح ہوتے جیسے کسی نے ساری کھال اتار لی ہو۔ ماموں ناصر اس دوران ریلوے کی ملازمت چھوڑ کر محکمہ تعلیم میں آ گئے مگر محکمے کی تبدیلی کا بھی اس ناگن نے کوئی اثر نہیں لیا۔ ماموں اس موسم میں پشاور میں ہوتے یا کوہاٹ میں، میران شاہ میں ہوتے یا ڈیرہ اسماعیل خاں میں۔۔ اپنے پیار کی آگ میں جلتی اور انتقام کی آگ میں سلگتی، غلط فہمی کی ماری وہ ناگن وہیں پہنچ جاتی، ان کے پاؤں سونگھتی اور انہیں اذیت میں مبتلا کر کے لوٹ جاتی۔ آفرین ہے اس ناگن کی اخلاقیات پر کہ اس نے ماموں کے پاؤں سونگھنے سے کبھی تجاوز نہیں کیا یہ الگ بات کہ اسی حرکت سے ہی ماموں کے پیروں کا ماس الگ ہو جاتا تھا۔ شاید وہ ان کے ماس ہی کو ان کے جسم سے الگ کرنا چاہتی تھی۔ ڈیرہ اسماعیل خاں میں قیام کے دوران جب وہ ناگن اپنے مُقرّرہ وقت پر پہنچی تو اتفاق سے ماموں صادق اور چند سٹوڈنٹس بھی وہیں موجود تھے۔ ماموں ناصر تو اس ناگن کو دیکھتے ہی سحر زدہ سے ہو گئے مگر ان کے شاگردوں اور ماموں صادق نے مل کر اس ناگن کا کام تمام کر دیا۔ یوں ''ناگن کا انتقام'' کی کہانی اپنے انجام کو پہنچی لیکن یہ کہانی کسی فلم کی سٹوری یا کسی قدیم مائتھالوجی سے اخذ کی ہوئی نہیں تھی۔ ماموں ناصر نے فلمی ہیرو کے برعکس زندگی کے ہیرو کی طرح اپنا پارٹ پلے کیا۔ فلمی ہیرو کی طرح مصنوعی کرب خود پر طاری نہیں کیا بلکہ واقعہ کی پوری اذیّت بھوگی اور سالہا سال موت سے معانقہ کر کے نیا جنم لیتے رہے۔۔ بم دھماکے اور غلط فہمی کی شکار منتقم مزاج ناگن کے واقعات کے بعد تیسرا اہم واقعہ ماموں ناصر کی ممانی آصفہ کے ساتھ شادی کا ہوا۔ یہ شادی ان کی زندگی کی ڈگر کو یکسر تبدیل کر گئی۔ ممانی آصفہ کے ذریعہ ہمارے ننھال میں زندگی کا ایسا طریقہ سامنے آیا جس کی پہلے ہمارے ننھال میں کوئی مثال موجود نہ تھی۔ ممانی آصفہ کے پاس بیٹھے ہوئے مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ''شیدا پستول'' جینٹری میں آ گیا ہو۔ بلکہ کبھی کبھی تو ماموں ناصر کی حالت بھی کچھ ایسی ہی دکھائی دینے لگتی ہے۔

مرحومہ ممانی مجیدہ سے ماموں ناصر کے چار بچے ہیں تین بیٹیاں اور ایک بیٹا۔۔ مُبارکہ، وحیدہ، غزالہ☆ مُبشّر احمد خالد۔۔ ممانی آصفہ سے دو بیٹیاں ہیں۔۔ عائشہ، بُشریٰ۔۔ ممانی مجیدہ

کی ساری اولاد شادی شدہ ہے بڑی بیٹی مبارکہ میری بیوی ہے۔ اس سے چھوٹی وحیدہ کے شوہر بشیر احمد شاہد عمر میں مجھ سے چھ ماہ بڑے ہیں اور سب سے چھوٹی غزالہ کے شوہر محمود عمر میں مجھ سے دو سال بڑے ہیں۔ یوں میں رشتہ کے لحاظ سے اس طرح ماموں ناصر کا سب سے بڑا داماد ہوں کہ ان کی بڑی بیٹی کا شوہر ہوں اور اس لحاظ سے اب تک کا سب سے چھوٹا داماد ہوں کہ دونوں چھوٹے داماد عمر میں مجھ سے بڑے ہیں ایں سعادت بزور بازو نیست

میرے بعض بھائیوں کو ایک دو ماموؤں سے شدید شکایتیں ہیں۔ ایک دفعہ میں انہیں سمجھا رہا تھا کہ ہر شخص کے اپنے حالات ہوتے ہیں، اپنی مجبوریاں ہوتی ہیں، ترجیحات ہوتی ہیں۔ اب ہمیں کسی ماموں کا شکوہ کرنے کی بجائے یہ دیکھنا چاہیے کہ ہم اپنے بھانجوں بھانجیوں کے ساتھ کیا سلوک کر رہے ہیں۔ تاکہ ہمیں بھی کل کلاں ان سے ویسے ہی ریمارکس نہ سننا پڑیں جیسے آج بعض ماموؤں کے بارے میں ہم دے رہے ہیں۔ شکوے شکایتیں تو رشتہ داری کا حصہ ہیں۔ ایک حد تک رہیں تو ان سے بھی محبت گہری ہوتی ہے۔ ویسے بحیثیت رشتہ ماموں کا رشتہ ماموں کا ہی ہوتا ہے۔ ہمارے بھانجوں کا ماموں ہو یا ہمارا ماموں، ہیر کا ماموں ہو یا رانجھے کا ماموں۔۔ بہن کو بھائی سے اور بھائی کو بہن سے سچی محبت ہو تو سارے ''مامے'' ایک جیسے ہی ہوتے ہیں۔ ماموں ناصر میرے لئے ''رانجھے کا ماموں'' ثابت ہوئے ہیں۔ رانجھے کا ماموں باقی دنیا کے ماموؤں جیسا ہوتے ہوئے بھی ان سے تھوڑا مختلف ہے۔ رانجھے کا ماموں اسے خود بانسری لے کر دیتا ہے۔ بھینسیں پلے سے خرید کر دیتا ہے۔ رومینٹک فضا پیدا کرنے میں ہر ممکن مدد کرتا ہے۔ کھیڑوں سے مقابلہ کرتا ہے اور پھر رانجھے کی ساری مشقتیں خود اٹھا کر اسے ہیر عطا کراتا ہے۔ مجھے یقین ہے اگر ماموں ناصر پہلے رانجھے کے دور میں اس کے ماموں ہوتے تو ہیر سے اس کی شادی کرا کے رہتے۔ دراصل ماموں ناصر طبعاً مذہبی ہونے کے باوجود صلح جو، انسان دوست اور محبتی انسان ہیں۔

عالمی امن کے لئے موجودہ دور کے بڑے ممالک جس طرح ''ہیر کے مامے'' بن کر دہائی دے رہے ہیں اگر رانجھے کے ماموں کو موقعہ دیں تو بہت سے جھگڑے فوراً ختم ہو سکتے ہیں، مثلاً اگر

افغان مسئلہ پر مفاہمت کے لئے ماموں ناصر کو ذمہ داری سونپی جائے تو ماموں، جنرل نجیب سے یوں بات کریں گے: افغان عبوری حکومت کے تمام ارکان ذاتی طور پر آپ سے دلی محبت رکھتے ہیں مگر بین الاقوامی مداخلت کے باعث مجبور ہیں۔۔ پھر افغان عبوری حکومت سے یوں بات کریں گے: جنرل نجیب تو آپ سب کی اتنی عزت کرتے ہیں کہ بیان سے باہر ہے مگر روسی دباؤ کے باعث ان کی پیش نہیں جا رہی۔اس لئے آپ اپنے رویے میں تھوڑی لچک پیدا کر کے ان کی مدد کریں۔۔ یوں چند ملاقاتوں کے بعد افغان مجاہدین اور جنرل نجیب کی مشترکہ حکومت قائم ہو جاتی۔افغانستان میں امن و امان ہو جاتا اور ساری بیرونی طاقتیں منہ دیکھتی رہ جاتیں۔

اس مثال سے ماموں ناصر کی ہمدرد، صلح جو اور محبتی طبیعت کو واضح کرنا مقصود تھا۔اس وقت عالمی امن کی خرابی میں سارا قصور ان بڑے ملکوں کا ہے جو خوامخواہ ''ہیر کے مامے'' بنے پھرتے ہیں جبکہ دنیا کو اس وقت خاص طور پر رانجھے کے ماموؤں کی ضرورت ہے۔ماموں ناصر جیسے لوگوں کی ضرورت ہے۔

☆☆☆

☆افسوس یہ خاکہ رسالہ ''صریر'' میں چھپنے کے بعد غزالہ اور محمود میں علیحدگی ہو گئی۔پتہ نہیں یہ اس خاکے کا اثر تھا یا محمود کی اپنی خاک کا۔۔

غزالہ اب محمد اجمل پاشا کی بیوی ہے خدا ان دونوں کو خوش رکھے آباد رکھے ۔

اور درویش کی دعا کیا ہے۔

محبت کی نمناک خوشبو

(آپی)

بنی ہوئی ہے ڈھال وہ میری خاطر حیدرؔ
مِرے مخالف کو جو کماں جیسی لگتی ہے

عام طور پر ماہرین کا خیال ہے کہ کسی بچے کے بعد جو بچہ پیدا ہوتا ہے ان دونوں میں خوامخواہ کی مخاصمت پیدا ہو جاتی ہے۔دراصل پہلا بچہ یہ سمجھتا ہے کہ بعد میں آنے والے نے اس سے اس کی ماں کی محبت چھین لی ہے۔۔اسی طرح ماہرین یہ بھی کہتے ہیں کہ پہلوٹھی کی اولاد اور باپ میں بھی ایک اندرونی مخاصمت ہوتی ہے کیونکہ عورت کی توجہ شوہر سے ہٹ کر پہلے بچے پر مرکوز ہو جاتی ہے۔یہ دونوں باتیں عمومی طور پر بڑی درست پائی جاتی ہیں لیکن آپی کی حد تک یہ دونوں باتیں غلط ثابت ہو چکی ہیں۔پہلی اولاد ہونے کے باوجود اباجی کو ہمیشہ آپی سے بے حد محبت رہی۔میں آپی کے بعد پیدا ہوا مگر ہم دونوں میں جو محبت ہے وہ شاید کسی اور بہن بھائی کے حصے میں نہیں آسکی۔ ماہرین کی دونوں باتیں غلط ثابت ہوئی ہیں تو یہ سراسر آپی کی اپنی خوبی ہے۔

امی جی بتایا کرتی تھیں کہ پیدائش کے وقت آپی انتہائی کمزور اور لاغر تھی۔ثبوت کے طور پر امی جی نے آپی کو پہنائی جانے والی پہلی قمیص سنبھال رکھی تھی جو شاید اب آپی کے پاس ہی محفوظ ہے لیکن اس وقت ہم سارے بہن بھائیوں میں جسامت کے لحاظ سے آپی اول نمبر پر ہے۔ایک دفعہ آپی نے مجھے کہا تم اتنے دبلے کیوں ہو۔مرد کا رعب اس میں ہوتا ہے کہ اس کا پیٹ تھوڑا سا بڑھا ہوا ہو۔بس پھر ایسا ''فیضانِ نظر'' ہوا کہ مِرے پیٹ کا رعب و

دبدبہ مسلسل بڑھتا ہی جا رہا ہے۔

آپی کی اور میری عمر میں ایک سال، ایک مہینہ اور ایک دن کا فرق ہے۔ بچپن میں جب کوئی ہم سے عمر کا فرق پوچھتا تو ہم بڑے مزے سے کہتے ایک سال، ایک مہینہ، ایک دن، ایک گھنٹہ، ایک منٹ ایک سیکنڈ۔۔ میری پیدائش پر آپی کمزور ہونے کے باوجود مجھے گود میں لے کر بیٹھتی۔ کاکا۔۔کاکا۔۔ کہہ کر باتیں کرتی۔ بچپن میں اکثر میں آپی کو ڈرایا کرتا تھا اور زیادہ تر ڈرانے کی وجہ سے ہی اباجی سے مار کھایا کرتا تھا۔ کبھی آپی کا کوئی قصور ثابت ہو جاتا تو اسے صرف ایک تھپڑ پڑتا۔ ایک دفعہ کسی عزیز نے اباجی سے کہا کہ آپ حیدر کو زیادہ مارتے ہیں مگر بیٹی کو بس ایک تھپڑ مار کر چھوڑ دیتے ہیں۔ اباجی نے کہا بیٹی کو مارنے لگتا ہوں تو وہ مٹی کی دیوار بن جاتی ہے پھر اسے کیا ماروں۔ حیدر کو لگتی کم ہیں اچھل کود زیادہ کرتا ہے اس لئے اسے مارنے میں بھی مزہ آتا ہے۔۔ پڑھائی سے آپی کو شروع سے ہی چڑ رہی ہے۔ ایسے لگتا ہے جیسے آپی کو بچپن میں ہی بلھے شاہ کے ''علموں بس کریں اویار'' والے تصور کا ادراک ہو گیا تھا۔ شروع شروع میں آپی کو زبردستی سکول بھیجنا پڑتا تھا۔ کچی جماعت کا امتحان ہوا۔ نتیجہ نکلا۔ آپی فیل ہو گئی۔ گھر آئی تو بڑی خوشی سے کہنے لگی: امی۔امی۔ گدھے گدھے جتنی لڑکیاں فیل ہو کر رو رہی تھیں۔ میں فیل ہو کر بھی ہنس رہی ہوں۔۔ گویا یہ بھی ایک بہادری تھی۔ اپنی شکست کو مسکرا کر تسلیم کرنا تھا۔

بچپن کے واقعات میں سے مجھے یاد آ رہا ہے۔ جب نانا جی ابھی ہندوستان میں ہی تھے، ہم نانا جی سے ملنے گئے۔ وہاں شہر کے چوک سے گلی کے موڑ پر ایک کنواں تھا جہاں سکھ حضرات کھلے عام نہایا کرتے تھے۔ ہم دونوں ایک دیوار کی اوٹ سے انہیں دیکھتے۔ بیک سائڈ سے لمبے بالوں کے باعث ہم انہیں عورتیں سمجھتے اور سوچتے کہ کتنی بے شرم عورتیں ہیں مگر جب ان کے چہرے سامنے آتے تو داڑھیوں کا ماجرا ہماری سمجھ میں نہ آتا اور ہم پریشان ہو کر گھر کی طرف دوڑ جاتے۔۔ باباجی کی گراموفون مشین کو ہم ہمیشہ حیرت سے دیکھتے۔ ریکارڈ بجتا تو ہم گانے کی طرف توجہ کرنے سے زیادہ گانے والوں کی تلاش شروع کر دیتے۔ کبھی بھونپو میں سے جھانکتے، کبھی لکڑی کے بکس کو کھٹکھٹاتے۔ ہم یہی سمجھتے تھے کہ گیت گانے والے یہیں کہیں چھپ کر گا رہے

ہیں۔۔ میں سادگی اور بھولپن میں آپی کا زیادہ دیر تک ساتھ نہ دے سکا۔ خانپور میں ہمارے گھر کے سامنے محکمہ صحت کی طرف سے حفظانِ صحت کے سلسلے میں فلم دکھائی گئی۔ فلم کے دوران دلچسپی برقرار رکھنے کے لئے وقفے وقفے سے فلمی گیت بھی دکھائے، سنائے گئے۔ ''رم جھم رم جھم پڑے پھوار۔ تیرا میرا نت کا پیار''

اس گیت کا سین دیکھا۔ ہیرو ہیروئن دو جھولوں پر بیٹھے جھولا جھول رہے ہیں۔ ہلکی ہلکی برسات ہو رہی ہے اور یہ گیت گایا جا رہا ہے۔۔ آپی بعد میں کہنے لگی: ہائے اللہ وہ بہن بھائی جھولا جھولتے ہوئے کتنے پیارے لگ رہے تھے۔ بس یہاں سے سادگی اور بھولپن کے معاملے میں ہماری راہیں ایک دوسرے سے الگ ہو گئیں۔

رحیم یار خاں میں ہمارے ایج گروپ میں بڑے پیارے پیارے بچے شامل تھے۔ آپا حفیظ، رضیہ (لجو) صفیہ (تپو)، سعیدہ، بشیراں، نسیم، ظفر، بشیر حقہ۔۔ بعد میں آپا حفیظ زچگی کے کیس کے دوران فوت ہو گئی۔ رضیہ ایئر ہوسٹس بن گئی مگر اچانک (؟) فوت ہو گئی۔ سعیدہ بے چاری ویسے ہی رسموں رواجوں کی بھینٹ چڑھ کر زندہ درگور ہو گئی۔ صفیہ اب لاہور میں ایک اچھی جاب پر ہے۔ بشیراں اور نسیم گھریلو زندگی نبھا رہی ہیں۔ ظفر ڈرائیور بن کر امارات کی طرف نکل گیا ہے۔ بشیر حقے کا پتہ نہیں چلا کہ اب کہاں ہے۔ ہم شام کے وقت گھر والی گلی میں سٹریٹ لائٹ کے نیچے مختلف قسم کے کھیل کھیلا کرتے تھے۔ خاص طور پر ایک کھیل۔۔ ''مائی نی مائی تنور تپیا کہ نائیں''۔ ایک اوٹ پٹانگ سا گیت بھی ہم نے بنایا ہوا تھا:

اللہ ڈوایا۔۔ چکی تلوں آیا (اللہ ڈوایا۔۔ چکی کے نیچے آیا)

اُتوں ماریا کھلا تلوں نکل آیا (اوپر سے جوتا رسید کیا گیا تو نیچے سے نکل آیا)

جس دوست کے ساتھ جھگڑا ہو جاتا۔ اللہ ڈوایا کا نام کاٹ کر اس دوست کے نام کو اللہ ڈوایا کے وزن تک کھینچ کھانچ کے لے آتے اور گیت شروع کر دیتے۔ ناراض دوست مارنے کو لپکتا اور یوں پھر سے صلح ہو جاتی۔ ان سب بچوں میں آپا حفیظ سے آپی کی دوستی بہت گہری تھی۔ زبیدہ جسے بچپن میں ہم بلو کہتے تھے ایک دفعہ اباجی کی دوکان پر آئی اور کہیں دوکان کے اندر ہی

جا کرسوگئی۔ابا جی نے سمجھا بیٹی گھر چلی گئی ہے۔شام کو دوکان بند کر کے آئے تو امی جی نے پوچھا: بلو کہاں ہے؟۔ابا جی نے سمجھا امی جی نے بلو کو چھپایا ہوا ہے اور جان بوجھ کر مذاق کر رہی ہیں لیکن جب پتہ چلا کہ بلو واقعی موجود نہیں تو پھر ہمارے گھر میں ہی نہیں سارے محلے میں افراتفری مچ گئی۔ تب آپی، میں اور ہمارے ایج گروپ کے بچے بلو کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔محلّہ قاضیاں سے لے کر ریلوے اسٹیشن تک گئے۔سب باری باری ایک ہی صدا لگاتے ''اے بلو۔اے.....'' جب ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک گئے تو گھر لوٹ آئے۔اس دوران ابا جی کو اچانک دوکان چیک کرنے کا خیال آ گیا تھا اور وہ بلو کو وہاں سے گھر لا چکے تھے۔اس رات آپی اور میں دیر تک بلو کو پیار کرتے رہے۔

بچپن میں آٹا پسوانے، کنویں سے پانی بھر کر لانے اور ٹال سے لکڑیاں لانے کے کام ہم دونوں بھائی بہن نے مل کر کئے۔بعد میں زبیدہ اور شاہدہ نے بھی ان مشقتوں میں ہمارا ہاتھ بٹایا۔ جب آپی کو کم عمری میں ہی برقعہ پہنا دیا گیا تو آپی نے گھر کا سارا کام سنبھال لیا۔میرا خیال ہے گھر کے کام کاج میں امی جی کو جتنا آرام ملا، آپی کی وجہ سے ملا، یا پھر مبارکہ کی وجہ سے۔۔وگرنہ ایک بیٹی نے تو اپنے سسرال سے بھی کپڑے دھلنے کے لئے امی جی کو بھیجنے شروع کر دیئے تھے اور ایک بہو نے چارپائی پر بیٹھ کر امی جی سے خدمت کرائی ہے۔ ماں، باپ اور بابا جی کی جو خدمت آپی نے کی اس کی توفیق اور کسی بہن بھائی کو نہ مل سکی۔ابا جی کی محبت ہم دونوں کے لئے یکساں تھی۔امی جی کی محبت میں پلڑا میری طرف تھوڑا سا زیادہ تھا جبکہ بابا جی کی محبت آپی کے لئے زیادہ بلکہ بہت زیادہ تھی۔گویا ماں، باپ اور بابا جی کی محبتوں کو جمع کریں تو ہم دونوں کا دامن برابر بھرا ہوا ہے اور اس میں کوئی تیسرا بھائی، بہن ہمارا حریف ہی نہیں۔

والدین کی خدمت کے بعد آپی کو سسرال جا کر اپنے سسر کی خدمت کا موقعہ ملا۔یہ بزرگوں کی دعائیں ہی تھیں کہ اللہ تعالیٰ نے آپی کو پانچ بیٹے اور ایک بیٹی کی دولت عطا کی۔سارے بچے خوبصورت اور صحت مند ہیں۔عرفان، عمران، کامران، صائمہ یکے بعد دیگرے پیدا ہوئے پھر لقمان اور نعمان (جنہیں ہم پیار سے چوچو اور نوما کہتے ہیں) جڑواں پیدا ہوئے۔ پی اے

ایف کے رہائشی ایریا میں دونوں بچوں کی وجہ سے بڑی شہرت ہوئی۔آپی جہاں بھی جاتی بچوں کو ایک ٹوکری میں فٹ کر کے بٹھا دیتی اور مزے مزے سے ٹوکری اٹھائے شاپنگ سنٹر یا ہسپتال سے ہو آتی۔ جڑواں بچوں کی ٹوکری دیکھ کے لوگ لطف اندوز ہوتے اور باری آنے سے پہلے آپی کو باری مل جاتی۔

بھائی عبدالرحیم ہنس مکھ اور خوش مزاج انسان ہیں۔محنتی اور مشقتی بھی بہت ہیں۔محنت کے نتیجہ میں ان کا جسم خاصا مضبوط ہے۔یہی مضبوطی ان کی اولاد میں بھی منتقل ہوئی ہے۔ایک دفعہ ٹرین کے سفر میں آپی کا منجھلا بیٹا کامران میرے ساتھ تھا۔رات کو میں نے اسے اوپر کی برتھ پر سلا دیا۔رات کے کسی لمحے میں کامران لڑھک کر نیچے آن گرا۔میں گھبرا گیا کہ بچے کا کوئی ہاتھ، پاؤں فریکچر نہ ہو گیا ہو۔کامران نے بولائی نظروں سے اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر سو گیا۔منزل مقصود پر پہنچ کر میں نے کامران سے پوچھا:

''بیٹے! کہیں ٹانگ یا بازو میں تکلیف تو نہیں ہے؟''

''نہیں تو۔۔ایسی تو کوئی بات نہیں۔۔لیکن آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟'' کامران نے الٹا مجھ سے سوال کیا تو میں نے اسے بتایا کہ رات تم برتھ سے نیچے گر گئے تھے۔ یہ بات سن کر کامران نے لاعلمی اور حیرت کا اظہار کیا اور میں اس کی حیرت پر حیرت زدہ رہ گیا۔گھر آ کر عزیزوں کو یہ بات بتائی تو ایک عزیز نے کہا: آپی کے سارے بچے ماشاءاللہ پتھر اور لوہے کے بنے ہیں۔اگر چھوٹے چوچو کو مکان کی چھت سے نیچے پھینکیں تو فرش اکھڑ جائے گا، چوچو کو کچھ نہیں ہوگا۔ ہرچند یہ بات مذاق میں کہی گئی تھی تاہم یہ حقیقت ہے کہ آپی کے بچے جتنے خوبصورت اور سمارٹ ہیں اتنے ہی مضبوط جسم کے مالک بھی ہیں۔

ابا جی کی روحانی قوتیں تھوڑی سی آپی میں بھی منتقل ہوئیں۔ خانپور میں ہمارے ایک ہمسائے میاں احمد بخش سیال بڑے اچھے آدمی تھے۔ ہمارے دادا جی کے دوست بھی رہے تھے مگر ایک مرحلے پر ہمیں محسوس ہوا کہ وہ بابا جی اور ابا جی کو لڑانے کا چکر چلا رہے ہیں۔آپی نے گھر میں ایک خاص مسنون دعا کا وِرد شروع کر دیا اور ان کے گھر پیغام بھجوا دیا کہ میں قریشی کی بیٹی ہوں۔

میں نے وِردشروع کردیا ہے جوکوئی بھی ہمارے گھر میں بے سکونی پیدا کرنا چاہتا ہے وہ اب نہیں بچے گا۔۔اسے دعا کا اثر کہیں یا نفسیاتی اثر لیکن دوسرے ہی دن میاں احمد بخش سیال شدید بیمار پڑ گئے۔ علالت کی حالت میں ہی انہوں نے اپنی ایک بہو کے ذریعے آپی کو معذرت کا پیغام بھیجااوراپنی صحت یابی کے لئے دعا کرنے کو بھی کہا۔

آپی کوتنہائی میں خود کلامی کی عادت ہے۔اگر آپی میں بھولپن زیادہ نہ ہوتا تو قریشیت کے روحانی اثرات اورتنہائی میں خود کلامی کی عادت کے باعث آپی بھی گوتم بدھ کی طرح کسی جنگل کی راہ لیتی اوراسے بھی گوتم جیسے گیان کی روشنی مل جاتی۔لیکن اس زمانے میں ایسا کیسے ہوسکتا؟۔۔ اچھا ہوا آپی کا بھولپن آڑے آ گیاوگرنہ خوانخواہ محکمہ جنگلات والوں نے چالان کر دینا تھا۔ بلکہ خدا کا شکر ہے کہ گوتم بدھ جیسی عظیم ہستی اس زمانے میں نہیں ہے وگرنہ محکمہ جنگلات والوں نے توشاید.....

آپی فطرتاً نیک دل اوررحم دل ہے۔دوسروں کا دکھ سن کر رونے بیٹھ جائے گی۔گھر میں جو کچھ ہوگا(حسب توفیق)سائل کودے دے گی۔البتہ اپنی معصومیت اوربھولپن کی وجہ سے کسی غلط فہمی میں مبتلا ہوجائے تو پھراسے دورکرنے میں بھی خاصا وقت لگتا ہے۔میرے ایک عزیز کو جو مجھے بے حد عزیز ہے۔اس کی سوتیلی والدہ نے آدھی رات کے وقت گھر سے نکلوادیا۔اس عزیز کو سارے شہر میں آپی کے گھر کے سوائے کوئی جائے پناہ نظر نہ آئی۔آپی اور بھائی عبدالرحیم نے اس عزیز کوٹھکانہ دیا۔اس سے ہمدردی کی۔اور جب وہ عزیز کسی باہر کے ملک چلا گیا تو اس سے اپنی نیکی کی پوری پوری سزا پائی۔اس عزیز کی زیادتی کسی غلط فہمی کا نتیجہ سہی۔مجھے اس سے محبت سہی لیکن میں اسے آج بھی اس معاملے میں قصوروار سمجھتا ہوں۔

ایک اور بہت ہی قریبی عزیز کو آپی اپنے ہاں لے گئی۔وہاں اسے جو کام بھی سکھانے پر لگاتے اس کی شہزادگی آڑے آجاتی۔میں نے خود دیکھا کہ آپی نے اپنے بچوں کا پیٹ کاٹ کر، اپنے شوہر سے چھپا کراس قریبی عزیز شہزادے کی خواہشیں پوری کیں۔آج آپی کے بارے میں سب سے زیادہ تضحیک آمیز باتیں کرنے کا شرف بھی اسی شہزادے کو حاصل ہے۔اس شہزادے

کے کردار میں بڑی جان ہے۔میں اس پر تفصیل سے لکھنے کا آرزومند ہوں لیکن شاید ابھی اس کردار پر لکھنے میں کچھ وقت لگے۔

میں اپنے پیچیدہ حالات کے باعث سنگین مسائل میں گھرا ہوا تھا۔میرے بعض سوتیلے عزیز جنہیں بعض دوسروں پر اپنے سوتیلے پن کا زہر نکالنا تھا مگر وہ ان کی دسترس میں نہیں تھے انہوں نے ان کے متبادل کے طور پر مجھے ہی نشانہ بنالیا،گھات ایسے لگائی کہ میرے ماں جایوں کو آگے کر دیا۔قریبی عزیز دشمن بن گئے۔خون کے رشتے ''خونی رشتے'' بن گئے۔سوتیلے عزیز اپنی فتح مندی پر نازاں تھے۔میری مجبوری کچھ اور تھی

احباب کے تیروں کے تو ہم عادی تھے حیدرؔ
اس بار مگر بھائی تھے،احباب نہیں تھے

ہر چند اب میں سنبھل گیا ہوں اوراس پوزیشن میں ہوں کہ سارے کرم فرماؤں کے قرض سود سمیت انہیں واپس کردوں۔تاہم اس سارے تماشے میں آپی کا کردار بڑا مضبوط،توانا اور مثالی رہا۔ایک بھائی اور بھابھی۔۔آپی کو میرے خلاف بھڑکانے گئے۔آپی کو جتنی باتیں معلوم تھیں انہیں کی حد تک جواب دیتی رہی۔جب وہ چرب زبانی سے چالا کی دکھانے لگے تو آپی نے انہیں دوٹوک لفظوں میں کہا: میں حیدراورمبارکہ سے تعلق نہیں توڑسکتی۔تم سمجھتے ہو میں حیدر سے تعلق توڑلوں گی۔اگر حیدر خود بھی مجھے چھوڑ دے میں تب بھی اسے نہیں چھوڑوں گی۔

جب مجھے اپنے ذرائع سے اس بات کا علم ہوا مجھے یوں لگا جیسے میں چار دن کا بچہ ہوں جسے ایک سال،ایک مہینہ اور پانچ دن کی کمزور سی آپی نے اپنی گود میں اٹھایا ہوا ہے۔مجھے اٹھائے اٹھائے وہ تھک گئی ہے مگر پھر بھی پیار سے ''کاکا۔۔۔کاکا'' کہے جارہی ہے۔پھر کاکا۔۔کاکا۔ کہتے ہی وہ بڑی ہوتی جارہی ہے۔اتنی بڑی کہ صرف میرے چہرے پر بیٹھنے والی مکھیوں کو ہی نہیں اڑا سکتی بلکہ مجھے کوؤں،چیلوں اور گِدھوں کے حملوں سے بھی محفوظ رکھ سکتی ہے۔اسی لمحے مجھے جیسے محسوس ہوتا ہے کہ میری مری ہوئی ماں دوبارہ جی اٹھی ہے۔

یہ محسوس ہوتا ہے جیسے

کوئی غم زدہ، بے نشاں چاپ
میرے تعاقب میں
اک نرم جھونکے کی صورت چلی آ رہی ہے
کوئی ہے۔۔جو میرے عقب میں
محبت کی نمناک خوشبو بکھیرے
اڈتے ہوئے تیز شعلوں سے مجھ کو بچائے
مرے ہر قدم کی سلامت روی کے لئے
التجاؤں، دعاؤں کی برکھا میں خود کو بھگوئے
مرے سر پہ آنچل کا سایہ کئے / آ رہا ہے!

☆☆☆

پسلی کی ٹیڑھ

(مبارکہ)

پھول تھا وہ تو میں خوشبو بن کے اس میں جذب تھا
وہ بنا خوشبو تو میں بادِ صبا ہوتا گیا

بیوی۔۔بالخصوص زندہ بیوی کا خاکہ لکھنا اپنی خیریت کو داؤ پر لگانے اور شیر بلکہ شیرنی کے منہ میں ہاتھ ڈالنے کے مترادف ہے۔بہرحال میں اقرار کرتا ہوں کہ جو کچھ لکھوں گا سچ سچ لکھوں گا۔سچ کے سوا کچھ نہ لکھوں گا۔اللہ میری حفاظت فرمائے۔(آمین)

مبارکہ میری ماموں زاد ہے۔میں غالباً چھ سال کا تھا، مبارکہ دو سال کی تھی۔ہمارے بیشتر رشتہ دار ایک خاندان کی طرح رہتے تھے۔کسی تقریب کے باعث اور بہت سارے عزیز بھی جمع تھے۔ بڑی ممانی نے لاڈ سے پوچھا فلاں سے شادی کروگے؟ میں نے صاف انکار کر دیا۔ پھر پوچھا گیا کس سے شادی کروگے؟۔۔میں نے بڑے اعتماد کے ساتھ مبارکہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا اس کے ساتھ کروں گا۔شاید بڑی ممانی کو میری پسند پر کوئی اعتراض تھا یا اپنی تجویز رد کئے جانے کا افسوس، فوراً بولیں: ''ہم ریاستیوں (سرائیکیوں) کو ایک رشتہ دے کر ہی بھولے ہیں۔اور کسی ریاستی کو اب رشتہ نہیں دینا''۔۔اس کا جواب مجھے اپنی یادداشت میں کہیں نہیں ملتا البتہ خاندان میں بڑی مستحکم روایت موجود ہے کہ میں نے جواباً کہا تھا: اگر آپ مبارکہ سے شادی نہیں کروگے تو جب یہ روٹیاں پکا رہی ہوگی جیپ لے کر آؤں گا اور اسے اس میں بٹھا کر لے جاؤں گا۔۔ماموں ناصر جو پاس ہی بیٹھے تھے، میرا جواب سن کر بڑی ملائمت

سے بولے: بیٹا! تم شرافت سے آنا میں خود ہی تمہیں بیٹی دے دوں گا۔

بچپن میں غیر شعوری اور غیر ارادی طور پر کہی ہوئی مذاق کی ایک بات اتنی سنجیدگی اختیار کر گئی کہ اب وہ سارا مذاق وجدانی معلوم ہوتا ہے۔ ممانی مجیدہ فوت ہو گئیں تو ماموں ناصر کے لئے بچوں کو سنبھالنا مسئلہ بن گیا۔ انہوں نے اپنے بیان کے مطابق خود ہی رشتے کا انتظام کر دیا۔ یعنی اس زبانی مذاق کے ٹھیک بارہ سال بعد ہمارے ساتھ عملی مذاق ہو گیا۔ میں اٹھارہ سال کا تھا، مبارکہ چودہ سال کی تھی جب ہماری شادی ہو گئی۔ ہماری شادی کیا تھی گڈی، گڈے کا بیاہ تھا۔ مجھے کچھ پتہ نہ اسے کچھ خبر! بے خبری کے عالم میں ولیمہ بھی ہو گیا۔ کئی دن گزر گئے اور ہم بے خبری کی جنت میں سوتے رہے۔ پھر یکا یک، از خود آگہی کا کوندا لپکا۔ اور پھر ہم پتوں سے اپنے تن ڈھانپنے لگے۔ آدم اور حوا کی کہانی آگے بڑھنے لگی۔

بچپن کے اس واقعہ کے حوالے سے میں نے ایک دفعہ مبارکہ سے کہا: بچپن کی معمولی غلطی کی کتنی بڑی سزا ملی ہے۔۔ اس نے فوراً کہا: غلطی آپ کی تھی، سزا میں بھگت رہی ہوں۔۔ خیر بات ہو رہی تھی آدم اور حوا کی کہانی کی۔ اس کہانی میں اتوار کے دن کو بہت بڑی اہمیت حاصل ہے۔ میں اتوار کے دن پیدا ہوا، مبارکہ بھی اتوار کے دن پیدا ہوئی، ہمارا نکاح بھی اتوار کے دن ہوا۔ پہلی بیٹی رضوانہ اتوار کے دن پیدا ہوئی۔ پہلا بیٹا شعیب اتوار کے دن پیدا ہوا۔ آخر حکومت پاکستان نے تنگ آ کر اتوار کی سرکاری چھٹی ختم کر دی اور چھٹی کے لئے جمعہ کا دن مقرر کر دیا۔

لڑکپن کے دو سال ہم نے اکٹھے گزارے تھے۔ پتہ نہیں یہ بچپن کی نامزدگی اور لڑکپن کی انڈرسٹینڈنگ تھی یا کچھ اور۔۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے مزاج شناس بن گئے۔ پھر بات مزاج شناسی سے بڑھ کر محبت اور دوستی کی سطح تک پہنچی اور وہاں سے بھی آگے بڑھی تو اس مقام کے بیان کے لئے کوئی لفظ نہیں ملا۔ بیوی، دوستی اور محبت۔۔ یہ سارے مقدس رشتے اب مبارکہ کے سامنے چھوٹے پڑ گئے ہیں۔ (خدا کرے مبارکہ پر اس جملے کا کچھ اثر ہو)

میں نے کتابی سلسلہ ''جدید ادب'' جاری کیا۔ اس میں مبارکہ کی تمناؤں کا لہو شامل تھا۔ ہر شمارے کے ساتھ اس کا ایک آدھ زیور بک جاتا۔ اس اللہ کی بندی نے ایک دفعہ بھی تکرار نہیں

کی۔ جب تک اس کا زیور ساتھ دیتا رہا ''جدید ادب'' جاری رہا۔ زیور ختم ہو گئے تو ''جدید ادب'' بھی بند ہو گیا۔ اب سوچتا ہوں میں نے اس کے ساتھ ظلم کیا ہے۔ لیکن مبارکہ نے بھی تو میرے ساتھ ظلم کیا ہے۔ میرے اچھے برے ہر طرح کے کاموں میں ہمیشہ میرا ساتھ دیا۔ کسی نازک موڑ پر آ کر اگر ساتھ دینا ممکن نہیں رہا تو اس نے کنارے پر کھڑے ہو کر نظارہ کیا مگر مجھے دباؤ ڈال کر روکنے کی کوشش نہیں کی۔ اس کے اس طرز عمل نے میری عادتیں بگاڑ دی ہیں۔ میری ''گمراہیاں'' اسے معلوم ہیں میرے ''گناہ'' اس کے علم میں ہیں لیکن مجال ہے اس نے کبھی مجھے شرمندگی کا ہلکا سا احساس بھی دلایا ہو۔

امی جی اور مبارکہ میں گہری انڈرسٹینڈنگ تھی۔ ساس بہو میں کبھی کبھی بدمزگی بھی ہوتی مگر ایسی نہیں جس میں ابا جی کو یا مجھے مداخلت کرنے کی ضرورت پیش آتی۔ جلد ہی ساس، بہو کی جگہ پھوپھی، بھتیجی آگے آ جاتیں اور خود ہی سارا معاملہ سنبھال لیتیں۔ آخر دم تک امی جی اور مبارکہ ایک ساتھ رہیں، صرف ایک سال کا عرصہ دونوں کو الگ رہنا پڑا کیونکہ خانپور چھوڑ کر ابا جی اور امی جی نے بالائی پنجاب میں سکونت اختیار کر لی تھی اور ملازمت کے باعث ہم شوگر ملز کی کالونی میں شفٹ ہو گئے تھے۔ اس ایک سال کے عرصہ میں بھی مبارکہ، امی جی سے ملنے کے لئے دو دفعہ گئی۔۔ اسی دوران ابا جی وفات پا گئے۔ شدید صدمے کا اثر زائل ہونے لگا تو سارے عزیز اپنے اپنے ٹھکانوں کو لوٹنے لگے۔ اکبر اور طاہر بھی امی جی سے اجازت لئے بغیر اپنی بیگمات کے ساتھ رخصت ہو گئے۔ جاتے جاتے امی سے اتنا کہہ گئے کہ عدت پوری کر کے ہمارے ہاں آ جایئے گا۔ مبارکہ جانتی تھی کہ امی جی اس طرح تو کسی بیٹے کے پاس بھی نہیں جائیں گی۔ اس نے مجھے الگ کر کے سارے صورتحال سے آگاہ کر کے کہا میں ایسی حالت میں پھوپھی کو اکیلے نہیں چھوڑ سکتی۔ آپ جا کر بچوں کے سکول چھوڑنے کے سٹیفکیٹ بھجوا دیں۔ میں اب پھوپھی کے پاس ہی رہوں گی۔ چنانچہ پھر مبارکہ اور بچے امی جی کے پاس ہی رک گئے۔

میں نے کہیں پڑھا تھا کہ میاں بیوی میں محبت بہت زیادہ ہو تو دونوں کی شباہت یکساں ہو جاتی ہے۔ فیض اور ایلس کی تصویریں دیکھ کر یہ بات سچ معلوم ہونے لگتی ہے۔ میرا خیال ہے

میری اور مبارکہ کی شکلوں میں بھی کچھ ایسا تغیر رونما ہو رہا ہے۔''من تو شدم تو من شدی'' کی حد تک تو محبت ٹھیک تھی لیکن جب اس مقام سے آگے بڑھی تو پھر دونوں کی شکلیں بگڑنے لگیں اور بگڑتے بگڑتے نوبت یہاں تک پہنچی کہ ''تم رہے نہ تم ہم رہے نہ ہم''۔۔۔۔۔۔اچھی بھلی شکلیں بگڑ گئیں مگر ہماری محبت کی شدت تو ثابت ہوگئی۔

میں اپنی فکری آزادہ روی کے باعث مبارکہ کے لئے بہت تکلیف کے سامان پیدا کر بیٹھا۔ مذہبی تعصّب رکھنے والے عزیزوں نے طوفان اٹھالیا۔مبارکہ دوہرے عذاب میں تھی۔اپنی سوسائٹی کو چھوڑنا بھی اس کے لئے ممکن نہیں تھا اور مجھ سے علیحدگی کا بھی وہ سوچ نہیں سکتی تھی۔میرا خیال ہے انسان کی مظلومیت بجائے خود ایک طرح کا مقام ولایت ہے۔مبارکہ مظلومیت کی حالت میں تھی۔محلے کی ایک پردھان عورت نے کہا: مبارکہ کو حیدر سے طلاق لے لینی چاہئے۔۔ چند ماہ کے اندر اسی عورت کی اپنی نوبیاہتا لیڈی ڈاکٹر بیٹی کو طلاق ہوگئی۔ ہمارے ایک ''بزرگ'' نے امریکہ سے دباؤ ڈالا اور میرے ساتھ مبارکہ کے سماجی بائیکاٹ کا حکم صادر کردیا۔حکم نامے کے ایک ماہ کے اندران کے اپنے خاندان میں بیٹے بہو میں پھوٹ پڑگئی جو بالآخر دونوں میں علیحدگی پر منتج ہوئی۔اسے مکافاتِ عمل کہئے۔نظامِ فطرت کہئے یا مظلوم پر جبر کا انجام۔رہے نام اللہ کا!

مبارکہ صاف دل اور صاف گو عورت ہے۔محبتی بیوی اور بے تکلف ماں ہے۔رضوانہ کو دیکھ کر عام طور پر ناواقف خواتین یہی سمجھتی ہیں کہ مبارکہ کی چھوٹی بہن یا نند ہوگی مگر جب انہیں معلوم ہوتا ہے کہ یہ اس کی بڑی بیٹی ہے تو حیران ہوتی ہیں۔ماں بیٹی میں صرف ساڑھے سولہ سال کا فرق ہے جبکہ میرے سب سے چھوٹے بھائی اعجاز اور میری عمر میں انیس سال کا فرق ہے۔(پس تم اپنے رب کی کن کن نعمتوں کا انکار کروگے)۔اپنے پانچوں بچوں رضوانہ،شعیب،عثمان، طارق اور درِثمین کے ساتھ مبارکہ نے دوستی کررکھی ہے۔ماں والی دھونس نہیں جماتی البتہ دوستانہ دھونس ضرور جمالیتی ہے۔

کسی کی شادی ہو۔۔مبارکہ شادی بیاہ کی تقریبات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی ہے۔ جب لڑکی کی رخصتی کا وقت آتا ہے دلہن سے زیادہ اس کے آنسو بہہ رہے ہوتے ہیں۔میں اس کی اس

رقیق القلبی سے خاصا تنگ تھا۔خدا بھلا کرے ماموں سمیع کی بڑی بیٹی نوشی کا۔۔نوشی کی رخصتی ہونے لگی تو ممانی راشدہ پرسکون تھیں۔ چھوٹی بہنیں مطمئن ۔مگر ان کی کزن مبارکہ بیگم حسب معمول رو رو کر ہلکان ہو رہی تھی۔اتفاق سے میری نظر نوشی کی طرف اٹھ گئی۔دولہا کے ساتھ گھر سے باہر آتے ہوئے بی بی مسکرا رہی تھی۔۔ گاڑیاں رخصت ہوتے ہی میں نے مبارکہ بیگم کو پکڑلیا۔ یہ کیا شرافت ہے۔جس کی شادی ہے وہ مسکرا رہی ہے۔اس کی ماں بہنوں کے چہروں پر اطمینان ہے اور آنجناب رو رو کر ہلکان ہو رہی ہیں۔اللہ اس کا بھلا کرے کہ تب سے اس نے شادی بیاہوں پر رونے دھونے کا سلسلہ فی الحال ترک کردیا ہے۔(فی الحال اس لئے کہ اپنی بیٹیوں کی شادی پر وہ ساری کسر نکالے گی☆)

مبارکہ کو مشرقی پنجاب سے غائبانہ انسیت ہے۔اس کی ظاہر وجہ تو یہ ہے کہ قیام پاکستان کے کئی برس بعد ممانی مجیدہ ہندوستان گئیں تو وہیں مبارکہ کی پیدائش ہوگئی۔ممانی مجیدہ سے ہی اسے معلوم ہوا کہ اس کی زچگی کرانے والی خاتون کا نام پیاری دیوی تھا۔سواسے مشرقی پنجاب سے بھی ایک لگاؤ ہے اور ''پیاری دیوی'' نام بھی بہت پیارا لگتا ہے۔اس انسیت کی بعض لاشعوری وجوہات بھی ہوسکتی ہیں۔مثلاً مبارکہ کے ددھیال،ننھیال سب مشرقی پنجاب سے پاکستان آئے تھے اور کئی جانوں کا نذرانہ دے کر پاکستان پہنچ پائے تھے۔ ہوسکتا ہے آباؤ اجداد کی سرزمین سے اسے لاشعوری طور پر محبت ہو۔پھر مبارکہ ذات کے لحاظ سے باجوہ جٹ ہے جو پنجابی جٹوں کی ایک اعلیٰ ذات ہے۔پانچویں چھٹی پشت سے یہ لوگ سکھ تھے۔اب جو مشرقی پنجاب میں سکھوں کی تحریک چل رہی ہے ممکن ہے مبارکہ کے اندر کی چھپی ہوئی سکھنی کو مشرقی پنجاب کی موجودہ حالت کے باعث بھی اس علاقے سے انسیت محسوس ہوتی ہو۔۱۹۸۷ء میں ہم بھارت گئے تو مبارکہ کی شدید خواہش تھی کہ مشرقی پنجاب کے علاقے دیکھے جائیں مگر دہلی میں بعض دوستوں نے سمجھایا کہ وہاں کے حالات بے حد خراب ہیں۔ایک دوست نے کہا ویزہ میں کل لگوادیتا ہوں مگر آپ لوگوں کو ادھر جانے نہیں دوں گا۔دراصل انہیں دنوں میں پنجاب میں ایک بس روک کر اس کے تمام مسافروں کو بغیر کسی تخصیص کے ہلاک کردیا گیا تھا۔اسی وجہ سے دلی کے دوستوں نے ہمیں مشرقی پنجاب نہیں

جانے دیااوراس علاقے کودیکھنے کی مبارکہ کی آرزو پوری نہ ہوسکی۔

میری شاعری کواس کے پورے پس منظر کے ساتھ جاننے والی واحد قاری مبارکہ ہے۔ اسے علم ہے کہ میری کون سی غزل یانظم کب کہی گئی اور کیوں کہی گئی۔۔اسے یہ بھی علم ہے کہ میں کس کس کو یہ باور کراچکا ہوں کہ فلاں غزل درحقیقت آپ کے لئے کہی گئی اور یہ بھی علم ہے کہ اصلاً کس کے لئے کہی گئی۔ میری شاعری سے باہر کے اس سارے کھیل تماشے کومبارکہ نے مزے لے کر دیکھا ہے۔میری دوستوں سے اس نے کبھی خارنہیں کھائی،الٹامحبت کی۔

ایک دفعہ میری ایک بہت اچھی دوست نے مبارکہ کی موجودگی میں بتایا کہ ہاتھ کی لکیریں دیکھنے والے ایک ماہر نے بتایاہے کہ تمہاری شادی کسی میرڈ Married سے ہوگی۔کوئی اورشاعر ہوتاتواس کی بیوی نے جوطوفان اٹھایا ہوتااس کی لہریں اخبارات کے ادبی ایڈیشنوں تک پہنچتیں مگر مبارکہ نے زوردار قہقہے میں ساری بات اڑادی۔ایک دفعہ بعض عزیزوں نے اسے سمجھایا کہ مردکااتنااعتبار کرنا بھی ٹھیک نہیں ہوتا(گویاتھوڑابہت شک کرتے رہناچاہیے)مگر مبارکہ پرکوئی اثر نہ ہوا۔جھلاکرایک عزیز نے یہاں تک کہہ دیا:اب تمہاری آنکھیں اسی وقت کھلیں گی جب وہ بچوں سے بھراٹوکرالے کرگھر آئے گا۔کبھی کبھی مجھے محسوس ہوتا ہے مبارکہ کے اندروہی دوسال کی بچی بیٹھی ہے جسے دیکھ کر میں نے کہا تھااسی کے ساتھ شادی کروں گا۔معصوم،بھالی بھالی ایسے کبوتر(بلکہ کبوتری)کی طرح جوبلّی کودیکھ کرآنکھیں بند کرلےاورخودکومحفوظ سمجھ لے۔مگرنہیں۔۔ مبارکہ نے توآنکھیں بھی ہمیشہ کھلی رکھی ہیں اور بلیوں کو دیکھ کر بھی خودکومحفوظ سمجھتی رہی ہے۔ قدرت خدا کی۔ ہرخطرے سے محفوظ بھی گزرجاتی رہی ہے۔ ہر چنداس میں خدا کی قدرت کے ساتھ میری شرافت کابھی دخل ہے۔

ایک دفعہ میں نے مبارکہ سے پوچھا:تمہیں مجھ پراتنااعتماد کیوں ہے؟

''اعتماد''؟۔۔مبارکہ نے حیرت سے کہااورپھررواں ہوگئی''تمہارے ساتھ شادی کون کرے گی؟ کس کادماغ خراب ہے؟شکرکروکہ میں مل گئی ہوں اوروہ بھی اس لئے کہ تمہارے ماموں کی بیٹی ہوں''

ان جملوں سے ہمارے درمیان پائی جانے والی (یک طرفہ) بے تکلفی کااندازہ کیاجاسکتاہے۔اس سے زیادہ مبارکہ کے بارے میں لکھنے کی جرأت نہیں۔اس خاکے کا دوسرا حصہ مبارکہ کی وفات کے بعدلکھوں یامیری وفات کے بعدوہ لکھے گی۔

☆☆☆

☆رضوانہ کی شادی پرساری کسرنکال دی ہے۔جزاک اللہ

اُجلے دل والا

(چھوٹا بھائی)

لڑائی جھگڑا تو حیدرؔ نہ تھا مزاج ان کا
وہ گھونٹ زہر کے بس پی کے رہ گئے ہوں گے

وہ پڑھائی میں تھوڑا کمزور تھا۔ رہی سہی کسر کلاس ٹیچر نے پوری کر دی۔ سبق نہیں سنا سکا تو بچے کے مذہبی فرقے کے حوالے سے اس پر تضحیک آمیز طنز کر دیا۔ گھریلو تنگ دستی کے باعث کبھی فیس بروقت ادا نہیں ہو سکی یا کوئی کاپی نہیں خریدی جا سکی تو اس کی سزا یہی ہوتی کہ اسے اس کے فرقے کے نام پر گالی دے دی جاتی۔ ایسے سفاک اور نفرت انگیز تعلیمی ماحول میں اس بچے نے کلاس ٹیچر کی کلاسز مس کرنا شروع کر دیں پھر سکول سے بھی غائب رہنے لگا۔ ایک طرف اسے کلاس میں کلاس ٹیچر کے اذیت ناک جملوں کا خوف تھا تو دوسری طرف اس بات کا ڈر کہ اگر اباجی کو سکول سے غائب ہونے کا علم ہو گیا تو مرمت ہو جائے گی۔ چنانچہ اس نے اپنے کھیلنے کے چند ٹھکانے بنا لئے جہاں وہ دوسرے لڑکوں کے ساتھ گولیاں اور اخروٹ کھیلتا۔ اسکول میں چھٹی کا وقت ہوتا تو گھر آ جاتا۔ تاہم سکول سے مستقل طور پر غیر حاضر نہیں رہتا تا کہ نام خارج نہ ہونے پائے۔ ایسی صورتحال میں اس نے پتہ نہیں کیسے آٹھویں جماعت کا امتحان پاس کر لیا۔ آٹھویں پاس کرتے ہی اس نے والدین سے صاف صاف کہہ دیا کہ وہ ایسے تعلیمی ماحول میں مزید علم حاصل کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتا۔ شاید ایسے پڑھے لکھے معاشرے میں اسے اپنا اَن پڑھ رہنا زیادہ بہتر لگا۔ والدین سے صلاح مشورے کے بعد چودہ سال کے اس

دبلے پتلے سانولے سے لڑکے نے اپنے شہر کو چھوڑ کر کراچی کی راہ لی۔ چھوٹی موٹی مزدوری سے کام کا آغاز کیا۔ ابتدائی ایک مہینہ خالہ کے ہاں قیام کیا۔ جیسے ہی پہلی تنخواہ ملی اس نے اپنی الگ رہائش کا انتظام کر لیا۔ متعصب معاشرے کی سفاکی کا شکار ہونے والا یہ چودہ سالہ لڑکا میرے ماں باپ کا منجھلا بیٹا اور میرا چھوٹا بھائی طاہر ہے۔

کہتے ہیں انسان کے دست و بازو اس کے بھائی ہوتے ہیں۔ ہم پانچ بھائی ہیں۔ پانچوں اپنی اپنی جگہ بے دست و پا۔۔ میں نے پندرہ برس کی عمر میں ملازمت کر لی تھی محض اس خیال سے کہ والدین کا بوجھ ہلکا کر سکوں۔۔ چنانچہ ابتدائی محدود دائرے میں جتنا ہو سکا والدین کی خدمت کرنے کی کوشش کی۔ ایک دفعہ ایک بھائی نے (جو اُس وقت پیدا ہوا تھا جب میں نے شوگر ملز کی نوکری شروع کی تھی) آپی سے گفتگو کے دوران میرے ذکر پر بڑے تلخ لہجے میں کہا کہ: ہم پر کسی نے کوئی احسان نہیں کیا۔ ہم نے اپنے ماں باپ کا کھایا ہے۔۔ مجھے اس بات کا پتہ چلا تو بے حد شرمندگی ہوئی۔ میں نے تو احسان جتایا ہی نہیں تھا بس والدین کی خدمت کرنے کی ایک تمنا تھی، قدرت نے ان کے جیتے جی اتنا دیا ہی نہیں کہ ڈھنگ سے ان کی خدمت کر سکتا۔ خیر بات یہ ہو رہی تھی کہ انسان کے دست و بازو اس کے بھائی ہوتے ہیں۔ میرے چار چھوٹے بھائی ہیں۔ ایک نے کوشش کی کہ میرے بازو کاٹ ڈالے دوسرے نے زور لگایا کہ میرے پیر باندھ دے۔ ڈھیٹ آدمی ہوں اس لیے سخت وار ہونے کے باوجود بچ نکلا ہوں۔ طاہر اور اعجاز دونوں بھائیوں کی مہربانی ہے کہ وہ اس کھیل تماشے میں غیر جانبدار رہے۔ میں ان کی غیر جانبداری کو بھی اپنی حمایت اور خود پر احسان مانتا ہوں۔۔ طاہر کو اس لحاظ سے میں خود سے بڑا سمجھتا ہوں کہ اس نے چودہ سال کی عمر میں ملازمت کر کے میرا کم عمری میں نوکری کرنے کا ریکارڈ توڑ دیا۔

طاہر بیس سال کا ہو چکا تھا لیکن وہ مجھے اس وقت پانچ چھ سال کا بچہ دکھائی دیا۔۔ اس عمر میں ہمارے خانپور کے ماحول میں ریوڑیاں، چنے، ڈرکو، اور میٹھی گولیاں کھانے کی خواہش ہوتی ہے۔ طاہر کو بھی اس عمر میں یہ ساری چیزیں کھانے کی خواہش ہوتی تھی لیکن گھر کی ہولناک غربت یہ خواہش پوری نہیں ہونے دیتی تھی۔۔ اب جو میں نے بیس سالہ طاہر کو دیکھا تو اس کی قمیص کی سائڈ

والی جیب میں ریوڑیاں، چنے اور ٹافیاں بھری ہوئی تھیں۔ گویا بیس سال کی عمر میں وہ اپنے اندر کے پانچ چھ سالہ بچے کی معصوم خواہشیں پوری کر رہا تھا۔

طاہر لوہے کی مشینوں پر کام کرتا ہے۔ ان مشینوں کی سختی اس کے ہاتھوں میں بھی منتقل ہوئی لیکن جس طرح لوہے کی سخت مشینیں بڑا نفیس قسم کا ریشم کا کپڑا تیار کر دیتی ہیں اسی طرح مجھے سخت ہاتھوں والا طاہر ہمیشہ ایسا نوجوان دکھائی دیا ہے جس کا دل ریشم کی طرح نرم اور ملائم ہے۔ اس ریشم جیسے دل کا کمال تھا کہ اسے نسرین نامی ایک گوری چٹی لڑکی دکھائی دی اور اس نے طاہر کے سانولے رنگ کی تلافی کا تہیہ کر لیا۔ چنانچہ وہ لڑکی کچے دھاگے سے بندھی چلی آئی اور ہماری بھابھی بن گئی۔ شادی کی تقریب کے معاملے میں اتفاق سے تھوڑی سی گڑ بڑ ہو گئی۔ امی جی اس انتظار میں تھیں کہ بارات اپنے گھر سے لے کر چلیں گے۔ اُدھر ماموں صادق نے نیک نیتی سے خیال کیا کہ کراچی سے ہی بارات لے جا کر شادی کر لیں کچھ رابطے میں کمی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ امی جی شادی میں شریک نہ ہو سکیں۔ ابا جی اور میں بھاگم بھاگ پہنچے۔ شادی کے موقعہ پر ایک عزیز طنزیہ قسم کے جملے بول رہے تھے۔ شادی ہوتے ہی طاہر اپنی دلہن کو لے کر امی جی کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ امی جی اتنے میں ہی خوش ہو گئیں۔ البتہ جب انہیں مذکورہ عزیز کے طنزیہ جملوں کا علم ہوا تو کچھ رنجیدہ سی ہو گئیں۔ پھر غم کی حالت میں ہی اتنا کہہ دیا کہ خدا اسے بھی اس کے بیٹے کی شادی میں شرکت کی توفیق نہ دے۔ قدرت خدا کی بعد میں اُسی عزیز کے بیٹے کی شادی پر صورتحال ایسی پیچیدہ ہو گئی کہ وہ اپنی عزت کا سوال بنا کر اپنے ہی بیٹے کی شادی میں شرکت سے محروم رہے۔

امی جی کا مبارکہ سے جو تعلق تھا۔ اس کی کوئی مثال لانا تو ممکن نہیں البتہ باقی بہوؤں میں امی جی کو طاہر کی بیوی نسرین زیادہ پسند تھی۔ خصوصاً امی جی اپنی زندگی کے آخری ایام میں کراچی کا سفر کر کے واپس آئیں تو طاہر اور نسرین سے بے حد خوش تھیں۔ طاہر کے تین پیارے پیارے سے بچے ہیں۔ نازیہ، دانش اور کرن۔۔ دانش کی پیدائش کے معاً بعد طاہر اور اس کے سسرال کے درمیان غلط فہمی پیدا ہو گئی۔ صورتحال تشویش ناک حد تک پیچیدہ تھی۔ مبارکہ نے چند دنوں کے دانش کو یوں سینے سے لگایا جیسے اسی کی کوکھ سے پیدا ہوا ہے۔ تب میں نے آپی اور اکبر کے ساتھ مل

کر مداخلت کی۔ فیصلہ بھابھی نسرین پر چھوڑ دیا گیا تو پیچیدہ صورتحال کے سارے پیچ خود بخود کھلتے گئے۔ سیتا جی ساری دنیا کو چھوڑ کر اپنے رام جی کے پاس آ گئیں۔ تب سے اب تک دونوں کے درمیان پھر کوئی غلط فہمی پیدا نہیں ہوئی بلکہ پہلی غلط فہمی نے میاں بیوی کی محبت کو مزید مستحکم کر دیا ہے۔۔ اس جھگڑے کو نمٹانے میں اکبر نے خاصی دانشمندی اور مہارت دکھائی۔

اکبر کی دانشمندی کے اعتراف کے ساتھ اس کی دو اور دانشمندانہ باتیں بھی یاد آ گئیں۔ میں باری باری سارے بھائی بہنوں کو یورپ میں آباد کرنے کا متمنی تھا۔ اکبر نے مجھے حیرت سے دیکھا اور کہنے لگا بھائی جان! اپنے گھر بار کی فکر کریں۔ پہلے خود آباد ہوں۔ پھر وہاں سے سب کو پاکستانی کرنسی میں عیدیاں اور امداد بھیج کر اپنا زیرِ احسان رکھیں۔ لاکھوں خرچ کر کے انہیں اپنے برابر لائیں گے تو وہ آپ کے ہی گلے پکڑیں گے۔ ایک بہن کو اس کے سارے بچوں سمیت مبارکہ کے ساتھ بھیجنا تھا مگر وہ صبر کے ساتھ انتظار بھی نہ کر سکی۔ فروری میں جھگڑا کر کے چلی گئی جبکہ مئی کے شروع میں مبارکہ کا کام بن گیا۔ تب مجھے اکبر کی دانشمندانہ بات شدت سے یاد آئی۔ ایک رشتہ دار کی بیٹیوں نے محلے میں ''تصوف کے مسائل'' پیدا کر رکھے تھے۔ ہم نے نیکی کے جذبہ کے تحت لڑکیوں کی ماں کو حالات سے احسن طور پر باخبر کرنے کی کوشش کی۔ وہ رشتہ دار بی بی الٹا لڑنے مرنے پر تل گئی۔ تب اکبر نے بتایا کہ مجھے ان لڑکیوں کے حالات کا علم ہے۔ ان کے خاندان کی فلاں فلاں بی بیوں کے احوال بھی معلوم ہیں۔ مگر سمجھانے کی ضرورت نہیں، سب کچھ کھلی آنکھوں سے دیکھتے بھی رہیے اور انجان بھی بنے رہیے۔ اسی میں کامیابی کا راز مضمر ہے۔ اکبر کی یہ بات بھی ٹھیک تھی۔ اس وقت ہماری ان رشتہ داروں سے علیک سلیک بھی نہیں ہے جبکہ اکبر کے گہرے مراسم ہیں۔

اکبر کی دانشمندی جملہ معترضہ کے طور پر بیچ میں آن ٹپکی، بات ہو رہی تھی طاہر کی۔ سماجی حالات کی بے رحمی نے طاہر کو اچھی تعلیم حاصل نہیں کرنے دی لیکن اپنے بچوں کے تعلیمی معاملات کی طاہر خود نگرانی کرتا ہے۔ اپنے بچوں کو اچھی تعلیم دلا کر گویا وہ خود تعلیم حاصل کر رہا ہے۔ اپنی زندگی میں طاہر سیدھا سادہ اور دیہاتی مزاج کا جوان ہے۔ کراچی شہر کی روشنیاں اس کی آنکھوں

میں چکا چوند پیدا کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکیں۔زندگی کو اس نے بِتایا نہیں بلکہ بھوگا ہے۔کئی بار ایسے وقت آئے کہ اسے فاقے کرنے پڑے،کبھی مسجد میں تو کبھی کسی دوکان کے تھڑے پر رات بسر کرنا پڑی۔اس نے سارے دکھ خاموشی سے جھیلے۔محنت مشقت کرکے حالات کا مقابلہ کیا۔ آج وہ کراچی جیسے شہر میں اپنے چھوٹے سے خاندان کے ساتھ عزت کی روٹی کھا رہا ہے۔عام طور پر تلخ حالات کا مقابلہ کرتے کرتے انسان کے لہجے میں کڑواہٹ آجاتی ہے۔مزاج میں چڑچڑاپن پیدا ہوجاتا ہے۔طاہر کا کمال ہے کہ اس نے تلخ ترین حالات سے گزر کر بھی اپنے باطن کی مٹھاس قائم رکھی ہے اور اپنے لہجے میں مزید نرماہٹ پیدا کرلی ہے۔

اپنے باپ کے بیٹے اور ماں جائے اس اجلے دل والے چھوٹے بھائی کو میں محبت کے ساتھ سیلوٹ کرتا ہوں!

☆☆☆

زندگی کا تسلسل

(پانچوں بچے)

میں نے اپنی دیانت کی سب دولتیں اپنی اولاد کو دیں فقط
اور باقی عزیزوں کو صرف اور صرف اپنے حصے کا گھر لکھ دیا

بعض والدین کی اولاد نالائق ہوتی ہے۔میں وہ خوش قسمت ہوں جو پانچ اچھے بچوں کا نالائق باپ ہوں۔میرے بچوں کی عالی ظرفی ہے کہ انہوں نے میری تمام تر نالائقیوں کے باوجود مجھے باپ کا پورا احترام دے رکھا ہے۔یہ بات میں نے مزاح پیدا کرنے کے لئے نہیں لکھی بلکہ واقعتاً ایک حقیقت بیان کی ہے۔زندگی بھر میں ادب اور کچھ اور فضول سے چکروں میں ایسا الجھا رہا کہ بچوں کی پرورش کی طرف دھیان ہی نہیں دیا۔ویسے اس کی ایک وجہ یہ بھی رہی کہ مبارکہ نے بچوں کو بخوبی سنبھال رکھا تھا۔پھر ابا جی اور امی جی بھی زندہ تھے اس لئے مجھے بچوں کی طرف دھیان دینے کی ضرورت ہی نہیں پیش آئی۔

رضوانہ میری پہلی بیٹی ہے۔ابھی میں خود کو بچہ ہی سمجھتا تھا کہ باپ بن گیا۔باپ کہلانے کی خوشی میں رضوانہ کی پیدائش پر میں نے اسے گود میں اٹھایا اور پیار سے اس کا منہ چومنے لگا۔اس پر ایک بزرگ نے مجھے ٹوکا کہ بیٹیوں کی پیدائش پر ایسی خوشی کا اظہار نہیں کرتے۔چونکہ مجھے ایسے رواجوں کی کچھ خبر نہ تھی اس لئے ان بزرگ کے احترام کو تو ملحوظ رکھا لیکن رضوانہ کو اسی طرح پیار کرتا رہا۔اس کے لئے کئی کھلونے خریدے لیکن اس کے کھیلنے سے پہلے ہی وہ کھلونے میرے چھوٹے بھائیوں چنّو،منّو کے ہاتھوں اپنے انجام کو پہنچ جاتے رہے۔

رضوانہ تھوڑی بڑی ہوئی تو اس کے لئے ایک ٹرائیسکل خریدی لیکن اس سے پہلے کہ رضوانہ اسے چلانا سیکھتی، یہ ٹرائیسکل بھی چنے، منے کے ہاتھوں اپنے انجام تک جا پہنچی۔ رضوانہ نے اس نقصان کی تلافی یوں کی کہ بڑی ہو کر بائیسکل چلانا سیکھی۔ پاکستان میں بھی اور جرمنی آ کر بھی، سکول جانا ہوتا یا کوئی چھوٹی موٹی شاپنگ کرنی ہوتی وہ اپنے بچپن کا سائیکلنگ کا شوق پورا کر لیتی تھی۔ اب تو خیر سے کار ڈرائیونگ بھی سیکھ چکی ہے۔

میں مار پیٹ کو اچھا نہیں سمجھتا لیکن ناتجربہ کار باپ ہونے کے زمانے میں بچوں کے ساتھ تھوڑی سی مار دھاڑ (مار کم اور دھاڑ زیادہ) ضرور کی تھی۔ بیٹوں کی مرمت کرنے میں تو خیر کوئی خاص حرج نہیں لیکن بیٹی کو مارنا زیادتی ہے۔ میں نے رضوانہ کو اس کے بچپن میں تین دفعہ مارا۔ اب سوچتا ہوں تو دو باتیں ذہن میں آتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ رضوانہ میں مجھے آپی کی ہلکی سی جھلک محسوس ہوتی ہے۔ آپی پہلوٹھی کی تھی، رضوانہ بھی پہلوٹھی کی ہے۔ بچپن میں شرارتیں کرنے پر مجھے خاصی مار پڑتی تھی مگر قصور ثابت ہو جانے کے باوجود آپی کو ایک تھپڑ یا چپت سے زیادہ سزا نہیں ملتی تھی۔ آپی سے محبت کے باوجود ہو سکتا ہے لاشعور میں غصے کی کوئی لہر دبی ہوئی ہو، پھر جب رضوانہ میں مجھے آپی کی جھلک نظر آئی تو رضوانہ کو پیٹ کر میں نے آپی کا غصہ اتار لیا۔ دوسری بات یہ بھی ہو سکتی ہے کہ بچپن میں اکثر یہ خواہش ہوا کرتی تھی کہ جلدی سے بڑا ہو کر ابو بن جاؤں اور پھر اپنے بچوں کی پٹائی کیا کروں۔ سو اس خواہش کی زد میں بھی پہلے رضوانہ ہی آئی۔ اب جو اُن تین پٹائیوں کو یاد کرتا ہوں تو اس کے سر اور کندھوں پر پڑے ہوئے سارے تھپڑ مجھے اپنے دل پر پڑتے محسوس ہوتے ہیں۔ رضوانہ کو تو شاید وہ مار یاد بھی نہ ہو مگر میں ابھی تک اپنے دل پر وہ مار سہہ رہا ہوں۔

سب سے چھوٹی بیٹی درِ ثمین (مانو) رضوانہ سے گیارہ سال چھوٹی ہے۔ ایک دفعہ مانو اپنی موج میں محمد رفیع کا ایک گیت توتلی زبان میں گا رہی تھی۔ بابل تی دعائیں لیتی جا، جا تجھ تو سُکھی سنسار ملے۔۔ رضوانہ نے مانو سے پوچھا: بابل کا مطلب جانتی ہو؟۔۔ مانو نے کہا: نہیں۔۔ اس پر رضوانہ نے اسے بتایا کہ بابل، ابو کو کہتے ہیں اور گیت کا مطلب یہ ہے کہ باپ اپنی بیٹی کی شادی کر کے اسے رخصت کر رہا ہے۔ ساتھ ہی اسے یہ بھی کہہ دیا کہ جب تمہاری شادی ہوگی تو تمہیں

رخصت کرتے وقت ابو یہی کسیٹ لگائیں گے۔ یہ بات سن کر مانو نے زاروقطار رونا شروع کر دیا۔ میں نے اور مبارکہ نے اسے سمجھایا کہ بیٹیاں تو ہمیشہ دوسرے گھروں میں بیاہی جاتی ہیں۔ یہ سن اس نے اور زیادہ رونا شروع کر دیا۔ میں نے امی ابو کو نہیں چھوڑنا۔ آخر ہم نے کہا اچھا بابا جیسا تم چاہو گی ویسا کریں گے، بس اب چپ کر جاؤ۔ بڑی مشکل سے اسے چپ کرایا تو رضوانہ کہنے لگی: ''چندری ماری! اتنا تو تم اپنی شادی پر بھی نہیں رووَ گی جتنا اب رو رہی ہو''۔

امی ابو نے جس طرح ہمیں مروّجہ اخلاقیات کی خوفناک حد تک تلقین کی تھی کچھ ایسا ہی رضوانہ کے ذہن میں بھی بٹھا دیا تھا۔ ''دیانت داری'' کا ایک دلچسپ واقعہ رضوانہ سے سرزد ہوا۔ رضوانہ اپنے بھائی عثمان کے ساتھ جا رہی تھی۔ رستے میں عثمان کو کرنسی نوٹوں والا ایک ہار ملا۔ اس نے اٹھا لیا۔ رضوانہ نے ایمانداری کے جذبے سے سرشار ہونے کے باعث عثمان کو سختی سے کہا کہ یہ ہار ہمارا نہیں ہے اس لئے اسے فوراً پھینک دو۔ عثمان چھوٹا ہونے کے باعث بڑی بہن کی بات ماننے پر مجبور تھا چنانچہ اس نے ہار پھینک دیا۔ مجھے اس کا علم ہوا تو میں نے بچوں کو سمجھایا کہ اصل دیانت داری کیا ہوتی ہے۔ رضوانہ کو اپنی حماقت کا احساس ہو چکا تھا۔ جلد ہی اس نے پہلی حماقت کی تلافی کر دی۔ اس بار بھی عثمان اس کے ساتھ تھا۔ رضوانہ کو چیونگم کا ایک پیکٹ سرِراہ ملا جو اس نے اٹھا لیا۔ اب عثمان نے اسے کہا کہ اسے پھینک دو۔ لیکن میں نے بچوں کو اصل دیانتداری کا جو مفہوم بتایا تھا وہ رضوانہ کو یاد تھا اور وہ اپنی پہلی حماقت کی تلافی بھی کرنا چاہتی تھی چنانچہ اس نے چیونگم نہیں پھینکی۔ عثمان کو آج تک اپنے کرنسی نوٹوں کے زیاں کا غم ہے۔ اس کا خیال ہے کہ دو تین سو روپوں والا وہ ہار ہمارے پاس ہوتا تو ہم بے حد امیر ہو گئے ہوتے۔

جب میں ابھی پاکستان میں تھا، رضوانہ نے مجھے جرمنی سے خط لکھا کہ میں نے مختلف مضامین میں اتنے اچھے نمبر لئے ہیں۔ ساتھ ہی لکھا ہمارے انگلش کے ٹیچر کہتے ہیں کہ تمہاری انگریزی اتنی اچھی ہے کہ اندازہ نہیں ہوتا تم برصغیر کے کسی ملک سے تعلق رکھتی ہو۔ اس پر میں نے اسے لکھا کہ آپ کے ٹیچر کے ریمارکس سے یہ یقین کرنے کی بجائے کہ آپ کی انگلش واقعی اچھی ہو گئی ہے، مجھے یہ یقین ہو گیا ہے کہ آپ کے انگلش کے ٹیچر کی اپنی انگلش خاصی کمزور ہے۔ یوں

بھی جرمنوں جیسی انگریزی تو میں خود بھی بول لیتا ہوں جسے انگریزی آتی ہی نہیں۔

رضوانہ، شعیب اور درِّثمین کی زبان بچپن سے ہی صاف تھی، تتلاہٹ نہیں تھی۔ عثمان 'ش' کو 'س' بولتا تھا۔ اس نے بھی اس کمی کو جلد کور کرلیا۔ ایک دن باہر سے کھیل کر آیا تو کہنے لگا میں اب ش بول سکتا ہوں۔ ہم نے کہا کوئی لفظ بولو۔ اس پر اس نے کہا ''شبنم'' (تب فلمی اداکارہ شبنم خاصی مشہور تھیں) ٹیپو (طارق محمود) کاف کو تاف اور گاف کو داف بولتا تھا۔ چار سال کی عمر میں اس نے مجھے بتایا کہ مجھے یہ گانا بہت اچھا لگتا ہے: تبھی نہ تبھی، تہیں نہ تہیں، توئی نہ توئی تو آئے دا (کبھی نہ کبھی، کہیں نہ کہیں، کوئی نہ کوئی تو آئے گا)

مانو (درِّثمین) ٹیپو کے توتلے پن کا مذاق اڑاتی۔ اس کی نقل اتارتے اتارتے خود توتلی ہوگئی۔ شروع میں تو ہم اس کے توتلے پن کو اس کا مذاق سمجھتے رہے لیکن جب یہ اس کی عادت بن گئی تب پریشانی ہوئی۔ گیت گانے کا مانو کو بہت شوق ہے۔ اپنی موج میں گاتے ہوئے اس نے کئی گیتوں کا حلیہ درست کر کے رکھ دیا تھا: تٹ تٹ باجرہ میں توٹھے اتے پانی آں (کٹ کٹ باجرہ میں کوٹھے اتے پانی آں)

تبھی تبھی مرے دل میں تھیال آتا ہے (کبھی کبھی مرے دل میں خیال آتا ہے)

کبھی کسی بھائی یا بہن سے تنگ آتی تو بڑا ایکشن بنا کر ماتھے پر ہاتھ مارتی اور کہتی:

''او مائی داڈ'' (او مائی گاڈ)۔

اب مانو کا توتلا پن ختم ہو چکا ہے لیکن فکرمندی کے باوجود اس کی توتلی زبان ایک عرصہ تک ہم سب کی دلچسپی اور تفریح کا سامان بنی رہی۔ رضوانہ سے سب سے زیادہ محبت بھی اسی کو ہے اور سب سے زیادہ جھگڑا بھی اسی کے ساتھ کرتی ہے۔ ایک دفعہ میں نے دیکھا دونوں میں کوئی اختلاف تھا۔ رضوانہ نے اس کے سر پر ایک چپت رسید کردی۔ مانو نے پہلے تو بڑی بیبیوں کی طرح بے حد سنجیدگی سے رضوانہ کو دیکھا اور پھر اپنے سے گیارہ سال بڑی بہن کو ڈانٹتے ہوئی بولی ''شرم نہیں آتی۔۔ بڑی باجی سے بدتمیزی کرتی ہو''۔ یہ ڈرامائی ڈائیلاگ سن کر رضوانہ نے اپنی پانچ سالہ ''بڑی باجی'' کو پیار سے گود میں اٹھالیا۔

مانو خواب دیکھنے سے زیادہ خواب سوچتی ہے۔ کئی دفعہ ایسا ہوا کہ سو کر اٹھی اور کہنے لگی ابو۔ ابو میں نے ایک خواب سوچا ہے۔ اس پر سارے بہن بھائی اس کا مذاق اڑاتے لیکن میں پوری سنجیدگی سے اس کا خواب سنتا۔ اس کے دیکھے ہوئے یا سوچے ہوئے خوابوں میں مجھے ننھی منی کہانیاں دکھائی دیتی ہیں۔ یہ ننھی منی کہانیاں مانو کے ساتھ کھیلتی رہتی ہیں اور لگتا ہے کہ کھیلتے کھیلتے مانو کے ساتھ ہی بڑی ہوتی جائیں گی۔ جہاں تک میں اندازہ کر سکا ہوں میرے باقی سارے بچے سائنٹیفک اور حقیقت پسند قسم کے ذہن رکھتے ہیں۔ میرا ادبی ورثہ شاید مانو سنبھالے گی۔ مانو میں مستقبل کی ادیبہ کی جھلکی مجھے کئی بار دکھائی دی ہے میں نے اباجی کا خاکہ لکھا تو پانچوں بچوں اور مبارکہ کو بٹھا کر سنایا۔ سب نے اسے پسند کیا۔ بعد میں جتنے عزیزوں کے خاکے لکھے سب سے پہلے پانچوں بچوں اور مبارکہ کو سنائے۔ باباجی کا خاکہ سب نے پسند کیا لیکن مانو نے فوراً کہا: ہائے ابو! آپ نے باباجی کا وہ نور جہاں کے گانے والا واقعہ تو لکھا ہی نہیں۔ تب مجھے مانو میں مستقبل کی ادیبہ کی جھلک پہلی بار دکھائی دی۔ اسی دن سارا خاکہ دوبارہ لکھا اور اس میں مانو کے یاد کرائے گئے واقعہ کا اضافہ کیا ور پھر اسے مانو سے OK! کرایا۔

ایبٹ آباد کی ملازمت کے دوران میں سکول کی لائبریری سے ٹیپو اور مانو کے لئے بچوں کی کہانیاں لے آیا کرتا تھا۔ آٹھ دس کہانیاں ایک ساتھ لے آتا بعد میں وہ کہانیاں واپس کر کے اور کہانیاں لے آتا۔ ایک بار مانو میرے پاس آئی اور کہنے لگی: ابو! آپ کو لیلیٰ مجنوں کی کہانی کا پتہ ہے؟۔۔ میرے کان کھڑے ہوگئے۔ سات سال کی بچی اور لیلیٰ مجنوں کی کہانی۔۔ یا اللہ خیر!۔۔ میں نے ملائمت سے پوچھا بیٹا! آپ نے یہ نام کس سے سنے ہیں؟ جواب ملا کہ کل آپ جو کہانیاں لائے تھے ان میں یہ کہانی تھی۔ میں نے کہانیاں چیک کیں تو واقعی ان میں سولہ صفحات کی ایک چھوٹی سی کہانی موجود تھی۔ اب مانو نے مجھے بتانا شروع کیا کہ یہ کہانی بہت اچھی ہے۔ مجنوں کی امی نے اسے بھیجا کہ لیلیٰ کے گھر سے گھی لے آؤ۔ لیلیٰ کی امی نے لیلیٰ سے کہا کہ مجنوں کو گھی دے دو۔ لیلیٰ نے کنستر اٹھا کر گھی انڈیلنا شروع کیا تو لیلیٰ اور مجنوں دونوں ایک دوسرے کو دیکھنے لگے اور کنستر کا سارا گھی زمین پر گر کر ضائع ہو گیا۔ اس پر لیلیٰ کی امی نے مجنوں اور لیلیٰ کو

ڈانٹا تو مجنوں ڈر کے مارے جنگل کی طرف بھاگ گیا۔لیلیٰ کی امی نے ٹھیک ہی تو ڈانٹا تھا۔اتنا سارا گھی گرا کر کتنا نقصان کر دیا تھا۔کہانی کے اس پڑ پر میں نے اطمینان کا سانس لیا۔پھر مانو کہانی سناتی رہی مگر میں اس وقت چونکا جب اس نے کہا کہ آخر میں لیلیٰ اور مجنوں مر کر دونوں ایک ہی قبر میں بند ہوگئے اور پھر وہاں ہنسی خوشی زندگی بسر کرنے لگے۔

ایک بار گھر میں بات ہو رہی تھی کہ ہاشم اور اُمیہ☆ جڑواں بھائی تھے۔ پیدائش کے وقت دونوں کی پیٹھ آپس میں جڑی ہوئی تھیں۔جنہیں تلوار سے آپریشن کر کے الگ کیا گیا۔سو ہاشم اور امیہ کی نسلوں میں بھی دیر تک تلوار چلتی رہی۔اس دوران میرے دو چھوٹے بھائی اعجاز اور نوید باہر سے گھر میں داخل ہوئے بچپن میں اعجاز کو چتّا اور نوید کو منّا کہتے تھے۔دونوں چاچوں کو ایک ساتھ دیکھ کر مانو نے بے ساختہ کہا: چُتّی مُنّی چُتّی مُنّی۔۔۔دو بھراواں دی اِکو پُنی (پنجابی میں بچے کی پیٹھ کو پُنی بھی کہتے ہیں)۔بس ایسے ہی واقعات سے میرا قیاس ہے کہ درِثمین (مانو) مستقبل میں ادیبہ بنے گی۔واللہ اعلم

رضوانہ کے بعد پہلا بیٹا شعیب (زلفی) تقریباً سوا دو سال کے وقفے سے پیدا ہوا۔شعیب سے ٹھیک ایک سال اور آٹھ دن کے بعد عثمان پیدا ہوا۔عثمان کی جلد بازی کے باعث شعیب نے ماں کا دودھ بہت کم پیا۔اس کا اثر اس کی صحت پر پڑا۔تاہم اب اس نے اس کمی کو بڑی حد تک پورا کر لیا ہے۔عثمان کے بعد لمبا وقفہ دینا پڑا کیونکہ شعیب کے علاوہ خود مبارکہ کی صحت بھی خراب ہو رہی تھی۔ساڑھے چھ سال کے بعد طارق (ٹیپو) پیدا ہوا اور اس سے ایک سال چار ماہ کے بعد مانو پیدا ہوئی۔

میں نے شروع میں بحیثیت باپ اپنی نالائقی کا اعتراف کیا ہے۔شعیب کے معاملے میں ایک بار یہ نالائقی حد سے گزر گئی۔ میرے بھائی اکبر کی شادی تھی۔ شعیب تقریباً چھ سال کا تھا۔اسے اکبر کا شہ بالا بنایا گیا۔کراچی سے شادی کر کے واپس آئے۔خانپور ریلوے اسٹیشن پر ساری بارات اتر آئی۔ اسٹیشن سے اتر کر تانگوں پر آ بیٹھے۔اچانک مبارکہ چلائی زلفی کہاں ہے؟ دراصل شعیب گاڑی میں سویا رہ گیا تھا۔گاڑی نے آخری وسل دے کر رینگنا شروع کر دیا تھا۔

چھوٹے بھائی طاہر نے دوڑ لگائی۔چلتی گاڑی میں چھلانگ لگا کر سوار ہوا، زنجیر کھینچی۔گاڑی رُک گئی۔شعیب بدستور برتھ پر سویا ہوا تھا۔طاہر اسے سوئے ہوئے کو اٹھا لایا۔اب بھی کبھی یہ واقعہ یاد آتا ہے تو اپنی نالائقی کا احساس بڑھ جاتا ہے۔اگر گاڑی نکل گئی ہوتی تو کیا ہوتا.....!

شعیب پڑھائی میں تیز ہے جبکہ عثمان جسمانی طور پر تیز ہے۔ایک بار طاہر نے اپنے بھتیجے عثمان سے کہا کہ اگر شعیب اور رضوانہ دونوں کو ہرا دو تو تمہیں دو قلفیاں کھلاؤں گا۔کھانے پینے کی چیزیں تو ویسے بھی عثمان کے اندر ایک نئی روح پھونک دیتی ہیں۔اس نے بڑی بہن اور بڑے بھائی کا اکیلے مقابلہ کیا۔جب بھی دبنے لگتا قلفیوں کے ذائقے کا احساس اس میں طاقت بھر دیتا۔ آخر اس نے دونوں کو ہرا کر اپنے چچا سے دو قلفیاں کھائیں۔ چونکہ شعیب ذہنی طور پر اور عثمان جسمانی طور پر تیز ہے اس لئے میں نے کئی بار من ہی من میں خواہش کی ہے کہ دونوں زندگی میں ایک ساتھ مل کر چلیں۔ میرا خیال ہے اس طرح دونوں زندگی کی کئی منزلیں آسانی سے سر کر لیں گے اور باقی بھائی بہنوں کا بھی خیال رکھ سکیں گے لیکن اگر دونوں نے الگ الگ رستے اختیار کر لئے تو شاید دونوں کو زندگی کی مشکلات سے نمٹنے میں قدرے وقت کا سامنا کرنا پڑے۔ دونوں زندگی میں کس طرح ایک ساتھ مل کر چلیں، اس کا کوئی واضح نقشہ میرے ذہن میں نہیں آتا۔ویسے ایک ساتھ مل کر چلنے سے میری مراد جائنٹ فیملی سسٹم ہرگز نہیں ہے۔

رضوانہ، شعیب اور مانو اسکول میں پڑھنے کے لئے شوق سے داخل ہوئے تھے۔ٹیپو بھی مانو کے ساتھ کی وجہ سے ہنسی خوشی چلا جاتا تھا۔البتہ کبھی بیماری کی وجہ سے مانو سکول نہیں گئی تو ٹیپو اکیلا اسکول جانے سے انکار کر دیتا۔صرف عثمان پہلے پہل سکول جانے سے گھبراتا تھا۔روتے ہوئے سکول جاتا اور وہاں بھی وقفے وقفے سے روتا رہتا۔ایک دن سکول سے آیا تو سلام کرنے کے بجائے اس نے دروازے سے ہی خوشی سے پکار کر کہا: آج میں سکول میں رویا بھی نہیں۔۔ بس پھر اس کے بعد تعلیم کے ساتھ اس کا تعلق جڑتا چلا گیا۔میرے بچے میری شاعری میں بھی آئے ہیں۔''پھاگن کی سفاک ہوا'' اور ''نصف سلور جوبلی'' دونوں نظموں میں میرے پانچوں بچے موجود ہیں۔ایک ماہیے میں دونوں بیٹیاں آئی ہیں:

مِری چڑیوں کی جوڑی ہے
اک پہلوٹھی کی
اک پیٹ کھروڑی ہے

میرا ایک ماہیا تھا:

دریا کی روانی ہے
اب مرے بیٹے میں
مری گزری جوانی ہے

اس پر عثمان نے پوچھا اس میں کس بیٹے کا ذکر ہے؟ ۔میں نے کہا اصولاً تو بڑا بیٹا ولی عہد ہوتا ہے اس لئے شعیب ہی ہونا چاہئے۔عثمان نے تحریکِ استحقاق پیش کرتے ہوئے کہا: آپ تو جمہوری نظام کے مدّاح ہیں۔بادشاہت اور کسی بھی طرح کی آمریّت کے خلاف ہیں اس لئے یہ ولی عہد کا شاہانہ خیال غور طلب ہے۔عثمان نے مزید وضاحت کرتے ہوئے اور اپنے موقف کو مستحکم کرتے ہوئے کہا کہ ویسے میں بھی جوان ہو چکا ہوں۔چنانچہ مجھے اس ماہیے میں تبدیلی کر کے جمع کا صیغہ لانا پڑا:

دریا کی روانی ہے
اب مرے بیٹوں میں
مری گزری جوانی ہے

اس طرح اب پانچ چھ سال کے بعد ٹیپو کو بھی شکایت کرنے کی ضرورت نہیں رہے گی۔ ماہیے میں ترمیم کرا لینے کے بعد عثمان نے پھر میری ایک غزل کا شعر بھی ایسی ہی ترمیم کے لئے پیش کر دیا۔

کاروبارِ عشق سے مل جائیں گی پھر فرصتیں   چند برسوں تک مرا بیٹا جواں ہونے کو ہے

یہاں جمع کا صیغہ لانے کی صورت میں ردیف میں گڑبڑ ہوتی تھی اس لئے میں نے اسے سمجھایا کہ اس شعر میں تیکنیکی وجوہ کی بنا پر تبدیلی کرنا ممکن نہیں البتہ آپ تینوں بیٹے اسے یکساں

طور پر اپنے اپنے لئے سمجھ لیں لیکن اپنا اپنا کاروبار ایک دوسرے سے الگ رکھیں۔یہ شعر میں نے شعیب اور عثمان کے جوان ہونے سے بہت پہلے کہا تھا لیکن اب دونوں جوانی کی دہلیز پر قدم رکھ رہے ہیں۔تو مجھے ایک لطیفہ شدت سے یاد آنے لگا ہے۔

ایک صاحب اپنے دوست سے شکایت کر رہے تھے کہ میرا بیٹا پڑھائی کی طرف بالکل توجہ نہیں دے رہا۔زیادہ تر یونیورسٹی کی لڑکیوں کے ساتھ گھومتا رہتا ہے۔کبھی یونیورسٹی کے لان میں، کبھی کنٹین میں، حتیٰ کہ یونیورسٹی سے باہر بھی۔اگر مجھے علم ہوتا کہ یونیورسٹی میں یہی کچھ ہوتا ہے تو اسے دوکان پر بٹھا کر بزنس میں لگا دیتا اور خود یونیورسٹی میں داخلہ لے لیتا۔

شعیب اور عثمان دونوں کو کرکٹ کھیلنے اور گیت گانے کا شوق ہے۔شعیب کی گیم بہت اچھی ہے میرے کالج کے طلبہ نے مجھے ایک بار بتایا تھا کہ سر! آپ کا بیٹا شعیب تو کرکٹ کا زبردست کھلاڑی ہے لیکن عثمان نے اس کی گیم کو کبھی اچھا تسلیم نہیں کیا۔اسی طرح عثمان نسبتاً گیت بہت اچھے گا لیتا ہے لیکن شعیب نے اس کی آواز کا ہمیشہ مذاق اڑایا ہے۔عثمان کی گلوکاری سے یاد آیا کہ رفیع، لتا، مکیش، مہدی حسن، نورجہاں، آشا، نسیم بیگم، مالا، سمن کلیان پور اور کشور کمار جیسے مقبول گلوکار تو ہر خاص و عام کی پسند ہیں۔عثمان کو بھی یہ سارے گلوکار پسند ہیں لیکن اس کے پسندیدہ گلوکاروں میں سہگل، سی ایچ آتما، ہیمنت کمار، طلعت محمود، گیتا دت اور منا ڈے زیادہ اہم ہیں اور اس کے پاس ان سب کے گیتوں کی بہترین کیسٹس موجود ہیں۔ایک بار کیسٹ پلیئر پر شعیب کا کوئی پسندیدہ گانا لگا ہوا تھا۔عثمان کی طبیعت جولہرائی تو اس نے گلوکار کے ساتھ سُر ملانا شروع کر دیا مگر شعیب نے اسے براہِ راست روکنے کی بجائے احتجاج کا انوکھا طریقہ نکالا۔گانے کی دھن کے مطابق سینہ کوبی شروع کر دی۔

ٹیپو کو اللہ میاں کو دیکھنے کا بہت شوق رہا ہے۔اس کے اس شوق کا ایک واقعہ امی جی والے خاکے میں آچکا ہے جس سے اس کے تجسّس اور تگ و دو کا اندازہ ہوتا ہے۔ٹیپو کے ایک اور ایکشن نے میری ایک پرانی الجھن دور کر دی تھی۔ابا جی کو یوں تو میرے پانچوں بچوں سے بے حد محبت تھی تاہم ٹیپو اور مانو چونکہ سب سے چھوٹے تھے اس لئے ان دونوں سے کچھ زیادہ ہی پیار کرتے تھے۔

نتیجتاً وہ محبت ان بچوں میں بھی ظاہر ہوئی۔ اباجی کی وفات پر ٹیپو پریشان تھا کہ دادا ابو جاگتے کیوں نہیں؟۔ اسے طریقے سے سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ اب نہیں جاگیں گے کیونکہ اللہ میاں نے انہیں اپنے پاس بلالیا ہے۔ ٹیپو نے غصے سے کہا میں اللہ میاں کو ماردوں گا۔ تب چار سال کے اس بچے کو مزید سمجھانا پڑا کہ اللہ میاں کے بارے میں ایسی بات نہیں کہتے کیونکہ وہ بہت بڑا ہے۔ ٹیپو کے نزدیک تو سارے خاندان میں دادا ابو ہی سب سے بڑے تھے چنانچہ اس نے پوچھا کیا اللہ میاں دادا ابو سے بھی بڑے ہیں؟ اس پر اسے یقین دلانا پڑا کہ اللہ میاں دادا ابو سے بھی بڑے ہیں اور ہر کسی سے بڑے ہیں۔ کوئی زیادہ سے زیادہ کتنا بڑا ہوسکتا ہے اور اس لحاظ سے اللہ میاں کتنا بڑا ہے؟ یہ جاننے کے لئے ٹیپو نے اپنے دونوں بازو کھولے اور انہیں جس حد تک پیچھے لے جاسکتا تھا، لے جاکر پوچھا: کیا اللہ میاں اتنے بڑے ہیں؟۔ بس اسی لمحے میں مختلف مذاہب اور فرقوں کے خدا کے بارے میں عقائد اور تصورات مجھ پر آئینہ ہوگئے۔ مجھے محسوس ہوا کہ سارے مذہبی لوگ ننھے منے معصوم بچوں کی طرح اپنی اپنی بانہیں پھیلائے کھڑے ہیں۔ جس کی بانہیں جہاں تک جاسکی ہیں اس نے اسی حد تک خدا کو بڑا سمجھ رکھا ہے کیونکہ اس سے زیادہ بڑائی اس کی سمجھ میں ہی نہیں آسکتی۔ تاہم اس سے مجھے تمام مذاہب کی خدا کے معاملے میں سچی جستجو اور محبت کا احساس ضرور ہوا۔ یہ الگ بات کہ اس کی ہستی کسی بھی عقیدے اور تصور سے بڑھ کر ہے۔

نام اور روپ سے جو بالا ہے   کس قیامت کے نقش والا ہے

وہ تو ایک مقدس بھید ہے۔ اس کی جستجو میں جتنا سفر کرلیں اس سفر کی لذت ہی اس کا اجر ہے لیکن اس سفر کا کوئی اختتام نہیں۔ بس کوئی جتنا سفر کرکے لذت کشید کرسکتا ہے کرلے۔۔ مذہب میں خدا کے نام پر نفرت پھیلانے کا کام تو تنظیمی قسم کے ادارے کرتے ہیں۔ جنہوں نے مذہب کو بندے اور خدا کا معاملہ سمجھنے کی بجائے خود اپنا معاملہ سمجھ لیا ہے اور یوں مذہب کو دوکانداری بنا کر رکھ دیا ہے۔

جس طرح شعیب کے فوراً بعد عثمان کی پیدائش سے شعیب کی جسمانی صحت پر اثر پڑا اسی طرح ٹیپو کے فوراً بعد مانو کی پیدائش سے ٹیپو کی صحت پر اثر پڑا۔ مانو، ٹیپو سے سوا سال چھوٹی ہے

لیکن ٹیپو سے پہلے اس نے چلنا سیکھ لیا۔ پھر مانو کی دیکھا دیکھی ٹیپو نے چھوٹے چھوٹے پاؤں اٹھانا شروع کردیئے۔ اور اب تو اس نے شعیب کی طرح اپنی جسمانی کمزوری کو بھی کور کرلیا ہے۔ ٹیپو کو بولنا سکھانے اور نام یاد کرانے میں بڑی دلچسپ صورت بنتی تھی۔ میں اپنے بچپن میں اپنے ابو کو ''ابوا'' کہتا تھا۔ ٹیپو مجھے ''ابوبا'' کہتا تھا شعیب اسے ہجے سکھا رہا تھا: ''کہو۔۔اب''

ٹیپو نے کہا ''اب''

پھر شعیب نے کہا ''بُو''۔۔   ٹیپو نے کہا ''بُو''

لیکن جیسے ہی جوڑ کرانے کے بعد شعیب کہتا ''ابُو''۔ ٹیپو بولتا ''ابوبا''۔ اپنا نک نیم اس نے ریورس گیئر میں لیا:

''کہو۔۔ٹی''   ''ٹی''

''پُو''   ''پُو''

''ٹیپُو''   ''پوٹی''

اب بھی کبھی کبھار میں اسے پیار سے ٹیپو کی بجائے پوٹی کہہ کر مخاطب کرلیتا ہوں۔ ٹیپو اپنے لسانی اصول کے مطابق مانو کو نوما کہتا۔ ٹیپو کی اس ذاتی گرائمر سے ہمارے ادب میں نئی لسانی تشکیلات والے پرانے ادباء شاید اپنے بعض بنیادی اصول وضع کرسکیں۔ ایک بار میں چارپائی پر لیٹا ہوا تھا اور دو سال کے چھوٹے سے ٹیپو کو اپنے سینے پر بٹھایا ہوا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا آپ کو باتیں کرنا آتی ہیں؟ ٹیپو نے اثبات میں سر ہلادیا۔ میں نے کہا پھر ابو سے باتیں کرو۔ ٹیپو نے بڑی معصومیت کے ساتھ وقفے وقفے سے بولنا شروع کیا:

''باتیں۔۔باتیں۔۔باتیں۔۔باتیں۔۔''

ایبٹ آباد میں قیام کے دوران سعید شباب بچوں سمیت خانپور سے آیا ہوا تھا۔ آپی کے بچے عرفان اور عمران بھی کراچی سے آئے ہوئے تھے۔ ہم سب ایبٹ آباد کے قریب واقع ایک مقام ٹھنڈیانی کی سیر کے لئے گئے۔ یہ مقام نتھیا گلی سے بھی زیادہ بلندی پر واقع ہے۔ یہاں بچوں نے گھڑسواری بھی کی۔ پہلا راؤنڈ مکمل کرکے شعیب، عثمان، عرفان، عمران واپس آئے تو شعیب

کے چہرے پر غصے اور کرب کے آثار دکھائی دے رہے تھے۔ میں نے سوچا پتہ نہیں بھائی سے یا کسی کزن سے کوئی جھگڑا کر بیٹھا ہے۔ لیکن جیسے ہی پکنک پوائنٹ پر پہنچا، گھوڑے کی باگ کھینچ کر بڑے ایکشن کے ساتھ کہا ''گھبر سنگھ! باہر نکل۔۔'' تب اندازہ ہوا کہ چہرے پر غصے اور کرب کے آثار اپنی اداکاری میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لئے طاری کئے تھے۔ ڈائیلاگ ایسے بے ساختہ انداز میں بولا گیا تھا کہ ہم دیر تک ہنستے رہے۔

شعیب بچپن میں مبارکہ کی ایک سہیلی سعیدہ کو بہت پیارا لگتا تھا۔ امی جی کو عثمان سے نسبتاً زیادہ پیار تھا۔ جبکہ خانپور کی ایک شاعرہ غزالہ طلعت ٹیپو سے بہت پیار کرتی تھی۔ میرے پانچوں بچوں کو اپنے دادا، دادی کی گود میں کھیلنے کا اعزاز حاصل ہے اور کسی بھائی کی ساری اولاد یہ سعادت حاصل نہیں کر سکی۔ رضوانہ کا بیاہ ایک پاکستانی نوجوان حفیظ کوثر سے ہو گیا ہے۔ منگنی سے پہلے میں نے رضوانہ سے بار بار کہا کہ لڑکے کو ایک نظر دیکھ لو۔ مگر اس کا ایک ہی جواب تھا آپ کو پسند ہے تو مجھے بھی پسند ہے۔ شعیب نے جرمنی پہنچتے ہی ایک عشق فرمالیا اور عشق کی ایک ہی جست میں سارے مرحلے طے کر کے فارغ ہو گیا۔ یہ عشق کیا تھا۔ ہیر، رانجھا۔۔ سوہنی، مہینوال۔۔ شیریں، فرہاد۔۔ ان سب کی داستانیں یک جا ہو گئی تھیں۔ میں نے شعیب کو مشورہ دیا ہے کہ آئندہ پرانی داستانوں کو دہرانے کی بجائے اپنی اوریجنل داستان بنائے۔ دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک۔

عثمان نے پہلے سے ہی واضح کر دیا ہے کہ میں تمام کزنز کو اپنی بہنیں سمجھتا ہوں۔ شادی خاندان سے باہر کروں گا۔ ٹیپو ابھی بارہ سال کا ہے لیکن اس نے سات برس پہلے یہ طے کر لیا تھا کہ بڑا ہو کر ابو بنوں گا۔ بیٹے کا نام رکھوں گا چوزہ اور بیٹی کا نام رکھوں گا نور خاتوں۔۔ مانو کے بارے میں کچھ لکھ دیا تو وہ پھر زار و قطار رونا شروع کر دے گی کہ میں نے امی ابو کو نہیں چھوڑنا اور پھر اسے چپ کرانا مسئلہ بن جائے گا۔

مشرقی تہذیب کی دولت کے ساتھ میرے بچے اس وقت مغرب کے کشادہ نظر ماحول میں اپنی عملی زندگی کی بنیادیں استوار کر رہے ہیں۔ اباجی کی شدید خواہش تھی کہ ان کے پانچوں بیٹے اور

ہو سکے تو چاروں بیٹیاں بھی، مل جل کر رہیں۔ میں اباجی کا یہ خواب پورا کرنا چاہتا تھا مگر ایک بھائی اور ایک بہن کی بے صبری اور ایک سوتیلی رشتہ دار کی مہربانی نے میرے باپ کے خاندان کا شیرازہ بکھیر کر رکھ دیا۔ اب میری خواہش ہے کہ جب میرے پانچوں بچے اپنے اپنے آباد گھروں والے ہو جائیں تب حالات کی مناسبت سے کوئی مدت مقرر کر کے ہفتے، مہینے یا سہ ماہی میں سارے بہن بھائی مل کر سچی محبت اور خوشی سے گیٹ ٹوگیدر کر لیا کریں تو میں سمجھوں گا اباجی کا خواب بھی پورا ہو گیا اور میری خواہش بھی۔ اپنے پانچوں بچوں کے لئے خوشحالی اور خیر و برکت کی دعا کے ساتھ مستقبل میں پانچوں کی خوشگوار اور کامیاب ازدواجی زندگیوں کی دعا میری طرف سے میرے بچوں کے لئے تحفہ ہے۔ اپنے بچوں کو دو عذابوں سے ہمیشہ بچنے کی تلقین کرتا ہوں۔ ان سے بچنے کی کوشش بھی کرتے رہیں اور دعا بھی کرتے رہیں۔ ایک عذاب غربت کی وہ سطح ہے جو انسان کو دنیا کے جھوٹے خداؤں کے سامنے محتاجی کی ذلت کی حد تک گرا دے۔ دوسرا عذاب تکبر کی لعنت ہے۔ ایسا تکبر جو ناحق دوسروں کو ذلیل کرائے۔ اگر بچے ان دونوں عذابوں سے بچ گئے تو بے شک ان کی زندگیاں کامیاب ہوں گی۔ انسان کا مقام خلیفۃ اللہ فی الارض کا مقام ہے۔ اس سے بڑھ کر کوئی مقام نہیں انسانیت ہی خدا کی اصل نیابت ہے۔

آدم اور حوا کی کہانی میں شجر ممنوعہ کے تعلق سے مختلف روایات میں گندم اور سیب کا ذکر ملتا ہے۔ اسی طرح ایک روایت میں شیطان کا سانپ بن کر گناہ پر اکسانا بھی مذکور ہے۔ گندم، سیب اور سانپ درحقیقت تینوں جنسی علامتیں ہیں۔ ابلیس کا تکبّر بے شک غلط تھا مگر اس کی یہ بات درست تھی کہ شجر ممنوعہ کھا کر آدم اور حوا ہمیشہ کی زندگی حاصل کر لیں گے اور واقعی آدم اور حوّا نے ہمیشہ کی زندگی حاصل کر لی۔ موت سے پہلے اپنی زندگی اپنی اگلی نسل کو سونپ دینا اور پھر اپنی موت کے بعد اپنی اگلی نسلوں میں جیتے چلے جانا، یہی تو ہمیشہ کی زندگی ہے۔ ابنِ آدم ہونے کے ناطے میں بھی اس زندگی کے تسلسل کا حصہ ہوں جو مر کر بھی نہیں مرتی۔ لاہور میں ایک بار ایک امریکی خاتون سے ملاقات ہوئی تھی۔ (احتیاطاً واضح کر دوں کہ یہ خاتون نیگریس تھیں) دورانِ گفتگو محترمہ نے میرے بچوں کی تعداد پوچھی تو میں نے کہا:

"Two daughters and three sons.Toatal five sins"

"but Holy sins" اس خاتون نے میری بات کا لطف لیتے ہوئے جملہ مکمل کر دیا۔ مجھے خوشی ہے کہ پاپولیشن پلاننگ کے اس دور میں بھی میں اپنے جدِّ اعلیٰ کے گناہ کو پانچ بار دہرانے میں کامیاب رہا ہوں۔ وما توفیقی الاّ باللہ

☆☆☆

☆ایک قاری نے توجہ دلائی ہے کہ ہاشم کے بھائی کا نام عبدالشمّس تھا۔امیہ ان کے بیٹے تھے اور ہاشم کے بھتیجے تھے۔ہاشم اور عبدالشمّس جڑواں بھائی تھے۔گھر میں گفتگو ویسے ہی ناموں سے ہوئی تھی تاہم تاریخی طور پر درستی ذہن میں رہے۔

اُردو ادب کے نوبل پرائز

(میرزا ادیب)

خاموشیوں کے لب پہ کوئی گیت تھا رواں
گہری اداسیوں کے کنول جھومتے رہے

میرزا ادیب سے مل کر مجھے ہمیشہ ایک روحانی خوشی کا احساس ہوا۔ اتنے بڑے اور سینئر ادیب ہونے کے باوجود انہوں نے ہمیشہ اتنی محبت دی کہ مجھ سے مارے خوشی کے سنبھالی ہی نہیں جا سکی۔ میں جب بھی ان کی خدمت میں حاضر ہوا، انہوں نے بڑھ کر گلے لگایا۔ دردمند دل رکھنے کے باعث دوسروں کے دکھ درد کو از خود محسوس کر لیتے ہیں۔ میرزا ادیب بحیثیت ادیب کئی جہات کے حامل ہیں۔ رومان نگار، افسانہ نگار، ڈرامہ نگار، خاکہ نگار، کالم نگار، سوانح نگار۔ اس نگار خانے سے ہٹ کر میرزا ادیب بچوں کے لئے لکھنے والے ادیب بھی ہیں اور ''ادب لطیف'' کے درخشندہ دور میں اس کے مدیر بھی رہے ہیں۔ میرزا ادیب کے ساتھ ان کے تمام دوستوں نے یہ زیادتی کی کہ ان کی طبعی شرافت کے باعث انہیں تواتر کے ساتھ بے حد شریف انسان کہنا شروع کر دیا اس کا نقصان یہ ہوا کہ جس طرح بعض لوگ کمینگی کی آخری حد پار کر جاتے ہیں، میرزا ادیب شرافت کی آخری حد پار کر گئے۔ آخر شرافت کی بھی کوئی حد ہونی چاہئے!

میرزا ادیب کی ذاتی زندگی کا جو عکس ''صحرا نورد کے خطوط'' اور ''صحرا نورد کے رومان'' میں نظر آتا ہے اور جو ایک رومانوی رویے کے طور پر ان کے افسانوں اور ڈراموں میں بھی صاف دکھائی دیتا ہے ان کی خودنوشت سوانح میں نمایاں ہو کر ابھر آیا ہے۔ خاکہ

نگاری اور کالم نگاری میرزا ادیب ''نظریۂ ضرورت'' کے تحت کرتے ہیں تاہم اس میں بھی وہ اپنے ادبی آئین کی روح کو پامال نہیں ہونے دیتے۔ بچوں کے لئے لکھے ہوئے میرزا ادیب کے ادب کو پڑھ کر مجھے وہ بچہ دلاور علی بار بار نظر آیا جسے گھر والوں نے کبھی بڑھئی بنانے کی کوشش کی تو کبھی لوہار بنانے کی سعی فرمائی مگر دلاور علی نے بڑھئی اور لوہار کے کام پر آوارہ گردی کو ترجیح دی۔ یوں اس کے بچپن کی آوارہ گردی اسے اپنے اندر کے صحراؤں میں لے گئی اور پھر ''صحرانورد کے خطوط'' سے وہ بچہ دلاور علی۔۔میرزا ادیب بن کر ابھرا۔ میرزا ادیب نے بچوں کے لئے کہانیاں اور ڈرامے لکھ کر اس بچے کو زندہ رکھا ہوا ہے جو ان کے اندر موجود ہے اور جو انہیں میرزا ادیب بنانے کا موجب بنا ہے۔ میرے نزدیک وہ بچہ تخلیقی قوت کا استعارہ ہے۔

''ادبِ لطیف'' کے دورِ ادارت میں میرزا ادیب نے متعدد ایسے نئے ادیبوں کو متعارف کرایا اور ان کی حوصلہ افزائی کی جو آج اردو ادب کے معتبر نام ہیں۔ ڈاکٹر سید عبداللہ نے لکھا تھا کہ میرزا ادیب صرف ادیب ہی نہیں، ادیب گر اور ادیب ساز بھی ہیں ''ادبِ لطیف'' کی ادارت کے زمانہ میں میرزا ادیب کی قابل قدر خدمات کے پیش نظر انہوں نے ازراہ تفنّن میرزا ادیب کا نام ہی عبداللطیف رکھ دیا۔ ''ادبِ لطیف'' کے دورِ ادارت میں میرزا ادیب کے دو اہم کارنامے ادب کی تاریخ میں ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔ اردو انشائیہ جب ابھی نوزائیدہ تھا اور اس صنف کا ابھی کوئی نام ہی نہیں رکھا گیا تھا تب میرزا ادیب نے اس نئی صنف کی حوصلہ افزائی کی۔ انشائیہ نام تجویز ہونے پر اسے رائج کرنے اور فروغ دینے میں بھی اہم کردار ادا کیا۔

میرزا ادیب کا بحیثیت مدیر دوسرا یادگار کارنامہ یہ ہے کہ جب ترقی پسند تحریک کے جنرل سکریٹری مغلوب الغضب ہو رہے تھے اور انہوں نے ایک قرارداد کے ذریعے منٹو، ممتاز مفتی، ممتاز شیریں، صمد شاہین اور متعدد دیگر ادباء کے خلاف ادبی بائیکاٹ کی مہم شروع کر کے ادب میں چھوت چھات کے نظام کی بنیاد رکھ دی تھی، تب میرزا ادیب نے بائیکاٹ کے اس غیر ادبی اور غیر اخلاقی حکم کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ ان کے نزدیک ترقی پسند یا غیر ترقی پسند کی بجائے ادب محترم تھا۔ وہ یہ تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھے کہ غیر ترقی پسند مگر اوریجنل اور اچھے ادیبوں کی تخلیقات

کا بائیکاٹ کیا جائے۔ چنانچہ انہوں نے بائیکاٹ کے فیصلے کی خلاف ورزی کی۔ ادارت چھوڑنے کے لئے تیار ہو گئے مگر اوریجنل ادیبوں کے بائیکاٹ کو انہوں نے اوچھی حرکت ہی سمجھا۔

ایک ادیب نے ایک بار مذاق کے طور پر کہا تھا: ''لاہور نے ایک ہی ادیب پیدا کیا ہے۔ میرزا ادیب''۔۔اس جملے پر غور کرتا ہوں تو بڑا سچ معلوم ہوتا ہے لاہور میں جتنے نامور ادباء ہیں دوسرے شہروں سے چل کر لاہور آئے اور پھر لاہوری ہو گئے لیکن میرزا ادیب اوریجنل ''لاہوری'' ہیں کرشن نگر اور بھاٹی گیٹ کی مٹی سے اُگے ہوئے اور جڑے ہوئے۔ لاہور کی ثقافت کے بیشتر شریفانہ اجزاء میرزا ادیب نے اپنے پاس رکھ لئے اور بے مروتی جوڑ توڑ، شرارت وغیرہ کے منفی اجزاء دوسروں کے لئے چھوڑ دیئے تاکہ جو چاہے بقدر ظرف یا حسب ضرورت حاصل کرتا رہے۔

رومانویت کے اثرات میرزا ادیب کی تمام اصناف میں ہی نہیں ان کی شخصیت میں بھی موجود ہیں۔ ایک دفعہ ایک ٹی وی پروگرام کی ریکارڈنگ کے سلسلے میں میرا اور فرحت نواز کا لاہور آنا ہوا۔ فرحت کی ایک عزیز سہیلی بھی ساتھ تھی۔ ہم میرزا ادیب کے پاس پہنچے۔ میں نے ان سے کہا ان دو بیبیوں میں ایک فرحت نواز ہے اور ایک اس کی سہیلی ہے۔ بوجھیئے کونسی فرحت نواز ہے؟ میرزا ادیب شش و پنج میں پڑ گئے۔ دونوں چہروں کو کافی غور و خوض سے دیکھنے کے بعد انہوں نے فرحت کی سہیلی کو فرحت نواز قرار دے دیا۔ شاید انہوں نے اپنے طور پر یہ سوچا کہ مرد ادیبوں کی طرح شاعرات بھی بہت زیادہ خوبصورت نہیں ہو سکتیں۔ لیکن جب انہیں پتہ چلا کہ ان کا اندازہ غلط ثابت ہوا ہے تو بہت خوش ہوئے اور اسی خوشی میں دیر تک فرحت کے سر پر دستِ شفقت پھیرتے رہے۔ تب مجھے شدت سے یہ خواہش ہونے لگی کہ کاش میں بھی میرزا ادیب کا ہم عمر ہوتا!۔۔پھر میرزا ادیب اٹھے اور اپنی تازہ کتاب ''مٹی کا دیا'' لے آئے۔ اس پر فرحت کا نام لکھا اور مجھے کہا۔ اوئے حیدر قریشی! اس وقت یہ ایک نسخہ ہے اس لئے یہ فرحت کو دے رہا ہوں، یہ پہلی بار میرے ہاں آئی ہے۔ تمہارا کیا ہے تم آتے ہی رہتے ہو، بعد میں لے لینا۔۔ڈاکٹر انور سدید نے بعد میں ''غالب کے نئے خطوط'' میں مورخہ ۸۲۔۱۔۷ کے خط میں اس واقعہ کا دلچسپ انداز میں ذکر کیا تھا۔

میرزا ادیب سادہ دل اور سادہ مزاج کے انسان ہیں۔ اپنے اوپر کوئی دوسرا روپ نہیں چڑھاتے۔ میں نے کئی ایسے ادیبوں کو دیکھا ہے جن کی اتنی ادبی حیثیت نہیں ہوتی جتنی وہ اپنی اداکاری سے ظاہر کرتے ہیں۔ اگر ایسے ادیبوں نے اداکاری کی بجائے ادب پر اتنی توجہ کی ہوتی تو شاید اپنی موجودہ بہروپیا حالت سے بہتر ہوتے۔ میرزا ادیب کی سادگی اور صاف گوئی کی انتہا یہ ہے کہ یہ بھی نہیں سوچتے کہ اس بات کے کرنے سے میری کم علمی تو ظاہر نہیں ہوگی۔ صحرانورد کے خطوط کے حوالے سے بات چلی۔ رحیم یار خاں کے چولستان تک پہنچی۔ میرزا ادیب نے چولستان کے سحر انگیز واقعات سنے تو بے حد حیران ہوئے پھر معصومیت کے ساتھ کہنے لگے کبھی موقعہ ملا تو میں آؤں گا مجھے چولستان کی سیر ضرور کرانا۔ حالانکہ اگر میرزا ادیب چاہتے تو اپنی حیرت کو اس خیال سے ہی چھپا لیتے کہ یہ نوجوان ادیب کیا سوچیں گے، ''صحرانورد کے خطوط'' لکھ ڈالے مگر صحرا کی شکل تک نہیں دیکھی۔ سادگی اور معصومیت کے یہ انداز اب ادیبوں میں کہاں ملتے ہیں۔ اب تو ہر شخص تیز تلوار ہے اور موقعہ کی تاک میں۔

میرزا ادیب نے ادب کی بڑی خدمت کی ہے۔ ادب والوں نے اس کا صلہ صرف اتنا دیا کہ ان کی بعض کتابوں پر مختلف انعامات دے دیئے۔ لیکن میرزا ادیب کی ادبی خدمات کا ابھی تک صحیح طور پر اعتراف نہیں کیا گیا۔ اب وقت آ گیا ہے کہ ادباءکرام اور ادبی ادارے اس طرف توجہ کریں۔ میرزا ادیب کی ادبی خدمات نصف صدی کا قصہ نہیں ہیں اس سے بھی زیادہ مدت کا قصہ ہیں۔ ہماری مجموعی عمر پچاس سال سے کوسوں دور ہے جبکہ میرزا ادیب اپنی ادبی زندگی کے پچپن سال بھی کبھی کے پورے کر چکے ہیں۔ کیا ہمارے ادبی اداروں کو کم از کم اتنی توفیق بھی نہیں ہے کہ میرزا ادیب کی ''ادبی گولڈن جوبلی'' منا ڈالیں؟

اگر ''نوبل پرائز'' عالمی سیاست کی بھینٹ نہ چڑھ گیا ہوتا اور نوبل صاحب خود بھی زندہ ہوتے تو میں خود نوبل صاحب کو خط لکھتا، میرزا ادیب کی کل کتابیں انہیں بھجواتا۔ مجھے یقین ہے انہیں نوبل پرائز ضرور دے دیا جاتا۔۔ ویسے میرزا ادیب اتنے شریف، محبتی، سادہ اور نوبل انسان ہیں کہ ان کا وجود خود اُردو ادب کے لئے نوبل پرائز کا درجہ رکھتا ہے۔

☆☆☆

ہم کہ ٹھہرے اجنبی

(فیض احمد فیض)

چند لمحے وہ ان سے ملاقات کے
میری سانسوں میں برسوں مہکتے رہے

فیض احمد فیض اردو شاعری کا ایک معتبر نام ہیں۔ شخصی حوالے سے دیکھا جائے تو ایک ملاقات اور چند خطوط کے تبادلے ہمارے درمیان تعلق کی وہ صورت پیدا نہیں کر سکے جو اجنبیت کو دور کرنے والی ہوتی ہے۔ یوں کہہ سکتا ہوں کہ میں فیض کے معاملے میں اجنبی کا اجنبی ہوں، لیکن فیض کی شاعری اور شخصیت دونوں میں اتنا جادو ہے کہ دور بیٹھے ہوؤں کو بھی اپنا اسیر بنا لیتا ہے۔ سو میں فیض کے ایسے اسیروں میں سے ہوں اور اس لحاظ سے ان کا شناسا بھی ہوں۔

فیض نے بچپن میں والدہ سے قرآن شریف پڑھا۔ کچھ حصہ قرآن شریف کا حفظ کیا۔ ایم اے انگریزی کیا۔ ایم اے عربی کیا۔ امرتسر کالج میں پڑھایا۔ برطانوی ہند کی فوج میں بھرتی ہوئے اور لیفٹیننٹ کرنل کے عہدے تک پہنچے۔ پاکستان بننے سے پہلے قائداعظم کی منظوری سے پاکستان ٹائمز اور روزنامہ امروز کے چیف ایڈیٹر بنے۔ بے باکانہ صحافت کے جرم میں ۱۹۴۸ء میں پہلی بار گرفتار ہوئے، مشہور راولپنڈی سازش کیس میں گرفتار ہوئے۔ مجموعی طور پر تین بار گرفتار ہوئے۔ فیض نے ادب کا لینن پرائز حاصل کیا جسے ''یار لوگوں'' نے ان کی شہرت سے زیادہ رسوائی کا موجب بنا دیا۔ پاکستان پیپلز پارٹی کے اولین دور حکومت میں وزیراعظم کے مشیر برائے تعلیمی و ثقافتی امور بنے۔ اسی دوران بیوروکریسی سے اختلافات کے

باعث مشیر کے عہدے سے مستعفی ہو گئے۔ مارشل لاء کا تیسرا دور آیا تو فیض کچھ عرصہ بعد ملک سے باہر چلے گئے۔ بیروت میں فلسطینی کاز کو تقویت پہنچانے کے لئے کام کیا۔ لوٹس کے مدیر بنے۔ وطن کی کشش پاکستان واپس لائی لیکن شاید یہ مٹی کا بلاوا تھا۔ پاکستان واپسی کے تھوڑے عرصہ بعد ۱۹۸۴ء میں فیض فوت ہو گئے۔ فیض کی زندگی کا یہ بے حد مختصر سا اشاریہ تھا۔

نقشِ فریادی، دستِ صبا، زنداں نامہ، دستِ تہہ سنگ، سروادیٔ سینا، شام شہر یاراں، مرے دل مرے مسافر اور غبار ایام یہ آٹھ شعری مجموعے شاعری کی دنیا میں فیض کی یادگار ہیں۔ ان مجموعوں پر مشتمل کلیات فیض ''نسخہ ہائے وفا'' کے نام سے چھپ چکی ہے۔ ''صلیبیں مرے دریچے میں''۔ متاع لوح وقلم'' اور ''ہماری قومی ثقافت'' فیض کی نثری کتابیں ہیں۔

فیض کے ناقدین دو طرح کے ہیں۔ ایک تو وہ جو اُن کے ہاں ایک دور تک تازگی اور شعری توانائی کو تسلیم کرتے ہیں مگر بعد میں ان کے ہاں انجماد کا احساس دلاتے ہیں۔ ایسے ناقدین میں ڈاکٹر وزیر آغا، انیس ناگی اور خورشید الاسلام جیسے معتبر لوگ شامل ہیں۔ اپنا موقف دلائل کے ساتھ ثابت کرتے ہیں تاہم اس کا اعتراف تینوں کو ہے کہ فیض ترقی پسند تحریک کی سب سے بڑی عطا ہیں اور ان کے ابتدائی مجموعے انہیں بطور شاعر زندہ رکھنے کے لئے کافی ہیں۔ دوسرے ناقدین جناب احمد ندیم قاسمی کے زیر اثر لکھنے والے ہیں اور ان کا اختلاف علمی و ادبی سے زیادہ ذاتی ہے۔ چنانچہ ایسے ناقدین نے کبھی فیض اور قاسمی کو ہم پلہ ثابت کرنا چاہا تو کبھی کسی حیلے سے جناب قاسمی کو فیض سے بھی بڑا شاعر ثابت کرنے کی کوشش کی۔ فیض کی وفات کے بعد خیال تھا کہ معاصرانہ چشمک ختم ہو جائے گی۔ لیکن جناب احمد ندیم قاسمی نے اخبار ''جنگ'' لاہور کو دیئے گئے ایک انٹرویو میں خود کو درباری شاعر ہونے کے الزام سے بچانے کے لئے فیض کو بھی درباری شاعر ہونے کا طعنہ دے دیا ہے۔ یہ طعنہ اور الزام حقائق کو مسخ کرنے کے مترادف ہے۔ فیض نے گرفتاری کے طویل تر زمانے کاٹے مگر جناب احمد ندیم قاسمی کی طرح حکومت کو پہلی اور آخری گرفتاری پر ایسی پیش کش کبھی نہیں کی کہ سرکار ہم پر اعتماد کریں ہم آپ کو ایسا ادب پیش کریں گے جو پولیس رپورٹوں کا متبادل ہوگا۔۔ فیض بھٹو دور میں مشیر رہے تو جوڑ توڑ کے ذریعے نہیں بنے بلکہ

ان کی صلاحیتوں کے اعتراف میں انہیں یہ عہدہ دیا گیا۔ اس میں بھی انہیں خلاف مزاج کام کرنے کے باعث الجھن محسوس ہوئی تو انہوں نے بلا تاخیر استعفیٰ دے دیا۔

فیض سے میری ملاقات ان ایام میں ہوئی جب وہ وزیر اعظم کے مشیر تھے۔ لاہور میں ان کے آفس میں سادہ سے کمرے، عام فرنیچر اور سخت گرمیوں کے باوجود چھت کے پنکھوں کے سوا کچھ نظر نہیں آیا۔ نہ اعلیٰ فرنیچر، نہ خوبصورت قالین، نہ ایئر کنڈیشنڈ۔۔ میں ادب میں نووارد تھا۔ خانپور میں ہماری محدود ادبی سرگرمیاں تھیں۔ روزنامہ ''مغربی پاکستان'' لاہور کا ایک شمارہ میرے پاس تھا جس میں خانپور کی ادبی ڈائری چھپی تھی۔ اس میں بیک وقت فیض اور نثری نظم کی تحریک کا ذکرِ خیر تھا۔ میں نے اپنا مختصر سا تعارف کرایا۔ اخبار پیش کیا۔ فیض نے ہلکے سے انداز میں حوصلہ افزائی کی پھر کہنے لگے آپ نوجوان لوگ ہیں نثری نظم کے جھمیلے میں کہاں پڑ رہے ہیں۔ سو میں فیض کے پاس سے ہی نثری نظم سے تائب ہو کر اٹھا۔۔ رسمی گفتگو کے بعد میں نے اپنا ذاتی مسئلہ پیش کیا۔ ایک عرصہ سے مناسب جاب کی تلاش میں سرگرداں ہوں مگر بغیر سفارش کے کہیں بھی دال نہیں گلتی۔ فیض تھوڑی دیر کے لئے سوچ میں ڈوبے، پھر سر اٹھایا۔ میرے ضروری کوائف معلوم کئے اور کہا ریڈیو کے اسسٹنٹ پروڈیوسر کی جاب کے لئے درخواست لکھ دو۔ میں نے وہیں درخواست لکھ کر ان کے حوالے کی اور گھر آ گیا۔ تقریباً ایک ماہ انتظار کے بعد میں نے انہیں ٹیلی گرام بھیجا۔ جواباً ان کا ٹیلی گرام آیا کہ درخواست آگے بھیج رکھی ہے بہتر امید رکھیں۔۔ تھوڑے عرصے بعد خبر سننے میں آئی، فیض نے وزیر اعظم کے مشیر کے عہدہ سے استعفیٰ دے دیا۔ میری قسمت میں تو مستقل بے روزگاری لکھی تھی میں نے فیض کو بھی بے روزگار کر دیا۔

تیسرے مارشل لاء کے کچھ عرصہ بعد فیض بیروت چلے گئے۔ مرزا ظفر الحسن سے ان کا پتہ حاصل کر کے ان سے ''جدید ادب'' کے لئے تازہ غزل منگائی:

سبھی کچھ ہے تیرا دیا ہوا سبھی راحتیں سبھی کلفتیں
کبھی صحبتیں، کبھی فرقتیں، کبھی دوریاں، کبھی قربتیں

یہ غزل سب سے پہلے ''جدید ادب'' میں چھپی۔ بعد میں اسے ''افکار'' اور ''سیپ'' نے بھی

شائع کیا۔ پھران کی نظم ''آج شب کوئی نہیں'' منگا کر شائع کی۔ ''جدید ادب'' سے لے کر جاپان کے پروفیسر کتاؤ کا نے اسے جاپانی میں ترجمہ کیا۔اس بارے میں فیض نے مجھے خط لکھا کہ پروفیسر کتاؤ کا کو پاکستانی رسائل بہت کم پہنچتے ہیں آپ جدید ادب انہیں بھیجتے رہا کریں۔

بھارت میں برادرم مناظر عاشق ہرگانوی آزاد غزل کی تحریک کو بڑھانے میں سرگرم ہیں۔ ایک بار انہوں نے مجھے آزاد غزلوں کا ایک انتخاب بھجوایا جس میں فیض کی ایک آزاد غزل بھی شامل تھی۔ مجھے حیرت ہوئی تاہم میں نے فیض کی آزاد غزل سمیت انتخاب چھاپ دیا۔یہی آزاد غزل پھر ماہنامہ شاعر بمبئی کے آزاد غزل ونثری نظم نمبر میں بھی شائع ہوئی۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ تو فیض کی ''شام شہر یاراں'' کی ایک نظم تھی جسے قطع وبرید کر کے بڑی عمدگی سے آزاد غزل بنا دیا گیا تھا فیض صاحب نے کسی محفل میں وضاحت کی کہ میں آزاد غزل اور نثری نظم دونوں ''خوبیوں'' سے پاک ہوں۔ کچھ عرصہ بعد فیض کی آزاد غزل کے سلسلہ میں آزاد غزل کے بانی مظہر امام سے جنگ لاہور میں چھپنے والے انٹرویو میں سوال کیا گیا تو انہوں نے کمال محبت سے فیض کی آزاد غزل کی دریافت واشاعت کا سہرا ''جدید ادب'' کے سر باندھ دیا۔ممکن ہے انہیں واقعی علم نہ ہو لیکن ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی زندہ ہیں وہ یقیناً اعتراف کریں گے کہ فیض کی آزاد غزل مجھے انہوں نے بھجوائی تھی سو اس کی دریافت کا سہرا انہیں کے سر ہے۔

فیض کم گو انسان تھے۔ کہتے ہیں کہ کم گو لوگ یا بہت چالاک ہوتے ہیں یا بہت بے وقوف۔فیض یقیناً ہوشیار آدمی تھے۔ پاکستان کے ماحول میں ان کی کم گوئی ان کے لئے سوسُکھ کا موجب بنی۔فیض بہت اچھے انسان تھے لیکن فرشتہ نہیں تھے۔راولپنڈی سے ایک ممتاز ادیبہ ابھری تھیں۔آج وہ تباہی کے دہانے پر کھڑی ہیں۔انہوں نے فیض کے مقام ومرتبہ کے باعث انہیں اپنے گھر پر مدعو کیا۔فیض ''ہم مشربوں'' کے ساتھ پہنچے۔ وہاں ایک دو دفعہ محفل ناؤونوش جمائی۔ پھر فیض اپنی دیگر مصروفیات میں الجھ گئے مگر ان کے بعض ''ہم مشرب'' تواتر سے وہاں جاتے رہے اور اپنی ثابت قدمی سے اس خاتون کو بھی اپنی محفل میں شریک کر لیا۔ملک کا سیاسی منظر نامہ تبدیل ہوا۔شراب مہنگی ہوئی تو یار لوگ تتر بتر ہو گئے۔ خاتون نشہ کی عادی ہو چکی تھیں۔آخر سستے نشے کی

طرف راغب ہوئیں۔ادبی تنقید کی متوقع ہیروئن۔۔نشہ آور ہیروئن کی بھینٹ چڑھ گئی۔ یہ زندہ لاش ابھی بھی راولپنڈی میں موجود ہے۔رشیدین (رشید امجد اور رشید نثار) سے تفصیلات معلوم کی جا سکتی ہیں۔ یہ لاش بزبان حال آج بھی اپنے مہربانوں سے کہہ رہی ہے:

ویسے تو تمہیں نے مجھے برباد کیا ہے
الزام کسی اور کے سر جائے تو اچھا

فیض بہت بڑے شاعر تھے لیکن ان کے ساتھ المیہ یہ ہوا کہ انہیں ایسے مدّاح مل گئے جن کے نزدیک فیض کی شاعری سے زیادہ ان کا ''پائے جامہ'' باعث افتخار رہے۔ مریدان باصفا شاید فیض کے کپڑوں سے برکت ڈھونڈنا چاہتے تھے۔ وہ تو خدا بھلا کرے ایلس فیض کا جنہوں نے قصۂ زمین برسرِ زمین ہی نمٹا دیا ورنہ ''پائے جامہ'' کے بعد ''زیر جامہ'' کی باری بھی آتی۔ غالبؔ کے ہاں تار تار گریباں اور دامن تار تار تو بہت ملتا ہے مگر پائے جامہ کا کوئی ذکر ہی نہیں ہے۔

میں فیض مرحوم کو دُور سے دیکھنے والوں میں سے ہوں لیکن میری دعا ہے کہ خدا انہیں قریب کے ان ساتھیوں کے شر سے محفوظ رکھے جن کے ہوتے ہوئے فلک ناہنجار کو ان سے دشمنی کی کوئی ضرورت نہیں رہتی۔

☆☆☆

عہد ساز شخصیت

(ڈاکٹر وزیر آغا)

جو اپنی ذات میں سمٹا ہوا تھا
سمندر کی طرح پھیلا ہوا تھا

میرا پہلا مضمون ۱۹۷۵ء کے لگ بھگ ''نگار پاکستان'' کے ایک شمارہ میں شائع ہوا تھا۔ مضمون کا عنوان تھا ''موجودہ ادبی بے راہ روی'' اس مضمون میں، میں نے ''ادب میں نیک مقصدیت'' کے تصور کو ادب کے لئے مضر سمجھا تھا اور ادب برائے زندگی اور ادب برائے ادب دونوں کے درمیان توازن قائم کرنے کی ضرورت کو محسوس کیا تھا۔ تب میں ادبی دنیا میں نووارد تھا اور جدید اردو ادب کا میرا مطالعہ نہ ہونے کے برابر تھا۔ تاہم ادب کے بارے میں میرے تصورات مبہم اور غیر واضح ہونے کے باوجود میرے اندر کی کسی طلب کے ترجمان تھے۔ اسی دوران مجھے ''تنقید اور احتساب'' پڑھنے کا موقعہ ملا تو یوں لگا میرے مبہم اور غیر واضح تصورات کو اصل صورت ملنے لگی ہے۔ یہ ڈاکٹر وزیر آغا سے علمی سطح پر میری پہلی ملاقات تھی۔ اس کے بعد ''نظم جدید کی کروٹیں'' اور ''نئے مقالات'' کے ذریعے ڈاکٹر وزیر آغا سے مزید دو ملاقاتیں ہوئیں اور مجھے احساس ہوا کہ ادب کے بارے میں جو کچھ میں سوچتا ہوں مگر میری گرفت میں نہیں آ پاتا وہ سب ڈاکٹر وزیر آغا کی گرفت میں ہے۔ بقول غالب:

میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

۱۹۷۸ء کے آخر میں ''جدید ادب'' کتابی سلسلے کے اجراء کا

پروگرام بنا۔ میں خانپور سے چل کر لاہور آیا۔ علی اکبر عباس پہلے ادیب تھے جو بڑی محبت سے ملے۔ میری حوصلہ افزائی کی۔ ٹی وی سنٹر اور پاک ٹی ہاؤس کی یاترا کرائی۔ لاہور کے ادیبوں سے نگارشات لے کر دیں۔ ''جدید ادب'' کے اولین کرم فرماؤں میں سراج منیر، اقبال ساجد، اسلام عظمی، خالد احمد اور بعض دیگر ادباء شامل تھے۔ علی اکبر عباس کے توسط سے ہی ان ادباء نے اپنی تخلیقات عطا کی تھیں۔ ''جدید ادب'' کا پہلا شمارہ چھپا۔ ادباء کی خدمت میں بھیجا گیا مگر اہل لاہور نے اسے چنداں اہمیت نہ دی۔ اسی دوران ڈاکٹر انور سدید کا ایک انٹرویو روزنامہ ''جسارت'' کراچی کے ادبی ایڈیشن میں شائع ہوا۔ اس انٹرویو کے ساتھ ان کا پتہ بھی درج تھا۔ میں نے انہیں خط لکھا اور ممکنہ حد تک قلمی معاونت کی درخواست کی۔ میں نے انور سدید کو خط کیا لکھا گویا دبستاں کھل گیا۔

دعا بہار کی مانگی تو اتنے پھول کھلے
کہیں جگہ نہ رہی میرے آشیانے کو

ڈاکٹر انور سدید نے مجھے لاہور کے چکروں سے نجات دلا دی۔ ادبی تحریروں کے حصول کے لئے اچھے اچھے ادیبوں کے پتے فراہم کئے۔ ان میں وزیر آغا بھی شامل تھے۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے میری معمولی سی درخواست پر جس محبت کے ساتھ اپنی نگارشات عطا کیں مجھے اس پر خوشگوار حیرت کا احساس ہوا۔ ''جدید ادب'' کے اجراء کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ بڑے شہروں کے ادیبوں کی اجارہ داری کے باوجود چھوٹے شہروں کے ٹیلنٹ کو بھی سامنے آنے کا موقعہ ملنا چاہئے۔ بعد میں پتہ چلا کہ اہل سرگودھا بھی ہماری طرح لاہوری ادیبوں کی اجارہ دارانہ ذہنیت کا شکار ہیں اور کئی برس سے علمی اور تخلیقی سطح پر مصروف جہاد ہیں۔

اس تمہید طولانی سے میرا مقصد یہ ظاہر کرنا تھا کہ ڈاکٹر وزیر آغا سے میرا تعلق کسی تعارف کے بغیر فکری سطح پر پہلے قائم ہوا تھا۔ ذاتی رابطہ اور شخصی سطح پر تعلق بہت بعد میں قائم ہوا۔ میں نے وزیر آغا سے اپنے تعلق اور نیازمندی کو دو خانوں میں بانٹ رکھا ہے۔ ایک خانہ علمی اور فکری تعلق کا ہے۔ ایک خانہ شخصی اور ذاتی تعلق کا ہے۔ علمی لحاظ سے میں ڈاکٹر وزیر آغا کو اپنا استاد اور

رہنما سمجھتا ہوں۔ان کی تنقید اور فکر سے میں نے ادبی رہنمائی حاصل کی ہے۔ میں نے افسانے لکھے تو انہوں نے قدم قدم پر مجھے شاباش دی۔حوصلہ افزائی کی۔مفید مشورے دیئے۔کبھی کبھی بعض مشوروں سے مجھے الجھن بھی ہوتی تھی۔ ابھی میں نے چند افسانے لکھے تھے جو زیادہ تر ’’اوراق‘‘ میں چھپ جاتے تھے۔افسانہ ’’پتھر ہوتے وجود کا دکھ‘‘ میں نے ’’اوراق‘‘ کے لئے بھیجا تو وزیر آغا نے مجھے خط لکھا: اگر آپ اسی انداز سے آگے بڑھتے رہے تو بہت جلد صف اول کے افسانہ نگاروں میں شامل ہو جائیں گے۔ چنانچہ میں نے احتیاطاً اپنا انداز بدل لیا تا کہ صف اول کے جدید افسانہ نگاروں میں شامل ہو کر اپنا حشر بھی ان جیسا نہ کرالوں۔ وزیر آغا نے مجھے انشائیے لکھنے کا شوق پیدا کیا۔ میں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز غزل سے کیا تھا۔وزیر آغا سے رابطہ ہوا تو مجھے پہلی بار ماہنامہ ’’اردو زبان‘‘ میں شائع شدہ نظم ’’دھوپ‘‘ کے ذریعے شاعر وزیر آغا سے ملاقات کا موقعہ ملا۔سردیوں کے موسم میں یہ نظم پڑھی تھی۔مسرت اور حیرت کی ایک انوکھی سی کیفیت مجھ پر طاری تھی۔میں شاعری کے ایک نئے ذائقے سے آشنا ہوا۔پھر ’’واپسی‘‘ اور ’’سمندر اگر میرے اندر گرے‘‘ نظمیں پڑھیں اور میں وزیر آغا کی نظموں کا ہمیشہ منتظر رہنے والا قاری بن گیا۔ میرے نزدیک وزیر آغا کی نظم میں جو جہانِ دیگر ہے وہ اس عہد کے کسی بھی دوسرے نظم نگار کو نصیب نہیں ہوا۔

شخصی سطح پر قلمی رابطے کے بعد ڈاکٹر وزیر آغا ۱۹۷۹ء کے اواخر میں اپنی بیٹی سے ملنے کے لئے رحیم یار خاں تشریف لائے۔خانپور بھی آئے۔تب ان سے ملاقاتیں ہوئی۔پہلی ملاقات کے وقت میرا پہلا تاثر یہ تھا کہ میں اس عہد کی اک بہت بڑی ادبی اور علمی شخصیت سے ملنے کا اعزاز حاصل کر رہا ہوں۔پھر کبھی بہاولپور، کبھی لاہور اور کبھی سرگودہا میں ان سے ملاقاتیں ہوئی اور یہ سلسلہ تا حال جاری ہے۔

ڈاکٹر وزیر آغا میں ایک خوبی یہ ہے کہ اپنے دوستوں کو مطالعہ کی طرف توجہ دلاتے رہتے ہیں۔عالمی ادب اور بالخصوص انگریزی ادب کی رفتار سے باخبر رہنے کی تلقین کرتے ہیں۔شروع شروع میں انہوں نے مجھے بھی انگریزی کتب پڑھانے کی کوشش کی لیکن ان کے چکر میں آئے بغیر

میں نے انہیں صاف صاف بتادیا کہ انگریز کی برصغیر پر سو سالہ غاصبانہ اور ظالمانہ حکمرانی کے باعث میں انگریزی زبان سے محبت نہیں رکھتا (انگریز خواتین اس سے مستثنٰی ہیں)۔دوسرے یہ کہ میری انگریزی اسکول کے زمانہ سے ہی اتنی خراب رہی ہے کہ انگریزی کتب پڑھنا میرے بس کا روگ نہیں ہے۔سوانہیں اندازہ ہوگیا کہ انگریزی زبان سے میری واقفیت کا حال ان کے ’’بھائیے‘‘ جیسا ہے۔ چنانچہ پھر انہوں نے مجھے اس چکر میں الجھانا مناسب نہیں سمجھا۔۔۔وزیر آغا سے دوستی اور فکری ہم آہنگی نے مجھے عملی زندگی میں شدید نقصان بھی پہنچایا ہے۔میں پہلے ہی سے کچھ صوفیانہ فکر و خیال کا آدمی تھا، اوپر سے وزیر آغا نے دنیا سے بے نیازی اور ادب کو ہی اولیت دینے کا اتنا اظہار کیا کہ میں نے دنیا اور اس کی محبت کو بہت ہی حقیر سمجھ لیا۔۔ بچے بڑے ہوئے۔سکول، کالج تک پہنچے۔اخراجات بڑھے۔مہنگائی بڑھی تو آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہوا۔تب پتہ چلا کہ دنیا سے اتنی بے نیازی بھی اچھی نہیں۔۔۔ دنیا سے بے نیازی اسی وقت اچھی لگتی ہے جب گھر میں کھانے پینے کے وافر اسباب موجود ہوں ورنہ انسان کا وہی حشر ہوتا ہے جو میرا ہوا۔

وزیر آغا کے بہت سے دوست بنے۔کچھ چند قدم چل کر جدا ہو گئے۔بعض نے لمبی رفاقت کے بعد جدائی اختیار کر لی۔۔بعض دوست غلام جیلانی اصغر، انور سدید، غلام الثقلین نقوی، صابر لودھی اور سجاد نقوی کی طرح دوستی نبھانے والے نکلے۔۔ جدا ہونے والوں میں سے کچھ لوگ جدا ہو کر خاموش ہو گئے۔۔کچھ نے مخالفت پہ کمر باندھ لی۔۔ایسا کیوں ہوا؟

میں یکطرفہ بے لوث اور بے غرض محبت کو نہیں مانتا۔محبت ہمیشہ دو طرفہ ہوتی ہے۔محبت بجائے خود ایک ایسا جذبہ ہے جو تسکین کی غرض رکھتا ہے۔ اس لئے میں یہ نہیں مانتا کہ وزیر آغا کو چھوڑ جانے والے لوگ محض اغراض کے بندے تھے۔اصل خرابی یہ تھی کہ شدید محبت کے باعث وزیر آغا سے ان کی توقعات بہت بڑھ گئی تھیں۔چنانچہ جب ان توقعات کو ٹھیس پہنچی تو جدائی واقع ہوگئی۔۔جدائی کے بعد بعض صاحبان خاموش ہو گئے اور بعض نے مخالفت پر کمر باندھ لی یہ تو اپنے اپنے ظرف کی بات ہے۔

وزیرآغا دشمن کے تیر سہنے کا حوصلہ رکھتے ہیں مگر دوستوں کے مارے ہوئے پھول نہیں سہہ سکتے۔ ہاں اگر دوست کھل کر دشمن بن جائے تو پھر اس کی زہریلی مخالفت کو بھی ایک ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ گھول کر پی جاتے ہیں۔ سطحی قسم کے مخالفین کے انداز مخالفت پر انہیں غصہ نہیں آتا بلکہ مخالفوں کی ذہنیت پر رحم آتا ہے۔ البتہ جو لوگ مکارانہ اور سازشی انداز اختیار کرتے ہیں ان کے رویّے پر وزیرآغا کو افسوس بھی ہوتا ہے اور رنجیدہ بھی ہوتے ہیں۔۔علمی اور فکری اختلاف رائے کو وزیرآغا نے ہمیشہ کشادہ بازؤں کے ساتھ سینے سے لگایا ہے۔مخالفت کی آندھیوں اور دشمنی کے سیلابوں کے پے در پے حملے سہنے کے باوجود اور اپنی عمر کے ستر برس عبور کر لینے کے بعد بھی وزیرآغا باغ و بہار شخصیت کے مالک ہیں۔شگفتگی ان کے مزاج کا حصہ ہے۔۔لطیفہ بازی، ہنسنے ہنسانے کا اکتسابی عمل ہے۔لطیفہ باز ادیبوں پر بعض اوقات اس کا اتنا گہرا اثر پڑتا ہے کہ ان کی تخلیقات بھی اکتسابی عمل دکھائی دینے لگتی ہیں۔لطیفہ بازی کی کئی عبرتناک مثالیں لاہور میں موجود ہیں۔وزیرآغا لطیفہ باز ہیں نہ جملہ باز۔۔وہ تو جملہ تخلیق کرتے ہیں اور اس میں ایسا بے ساختہ پن ہوتا ہے کہ نشانہ بننے والا بھی لطف اندوز ہوتا ہے۔شاید اس لئے بھی کہ ان کے جملے میں ڈنک نہیں ہوتا۔

عام طور پر مجلسوں میں ہنسنے ہنسانے والوں کا علم کا خانہ خالی ہوتا ہے مگر وزیرآغا ایک طرف شگفتگی اور خوش مزاجی کا سمندر ہیں تو دوسری طرف علم کا بحر ذخار ہیں۔ میں نے نجی گفتگو میں بھی وزیرآغا سے بہت کچھ سیکھا ہے۔الٰہیاتی مسائل، روح کی حقیقت، انسان کی مخفی قوتیں اور کائنات کی بے پناہ وسعتیں۔۔ان موضوعات پر ان سے کھل کر باتیں کی ہیں۔بعض ایسی باتیں جو اپنے آپ سے کرتے ہوئے بھی کبھی کبھار خوف محسوس ہوتا ہے وزیرآغا سے بے خوف ہو کر کی ہیں اور ان کی گفتگو سے بہت کچھ حاصل کیا ہے۔ان کے گاؤں وزیر کوٹ میں کھیتوں کے دور تک پھیلے ہوئے سلسلے بھی دیکھے ہیں اور آسمان پر ڈوبتے سورج کا منظر بھی دیکھا ہے۔۔طویل وعریض کھیتوں میں کھڑے ہو کر میں نے یہ تجربہ بھی کیا کہ کس طرح معمولی سا زاویہ بدلنے سے سامنے کا سارا منظر تبدیل ہو جاتا ہے۔اس سے کائنات کی نیرنگیوں کا اندازہ ہوا۔

وزیرآغا نے ایک دو بار میرے گھر کو بھی اپنی آمد سے رونق بخشی۔ایک دفعہ اباجی کی زندگی میں آئے۔اباجی اور وزیرآغا کی مختصر سی ملاقات ہوئی۔اباجی کسی اور لائن کے آدمی تھے لیکن وزیرآغا کے جانے کے بعد خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہنے لگے بھئی تمہارے وزیرآغا کی آنکھوں میں بڑی انوکھی چمک ہے اور اس کے چہرے پر کسی روشنی کا ہالہ سا محسوس ہوتا ہے اباجی کی ملاقات و۔ع۔خ سے ہوتی تو شاید کچھ ایسی صورت بنتی:

اس نے کاغذ پہ لکھا روگ تمہارا یہ ہے
میں نے کاغذ پہ لکھا روگ تمہارا بھی تو میرے ہی سجل روگ کا آئینہ ہے
اور پھر آئینے اک دوسرے کو دیکھ کے حیران ہوئے
اپنے روگوں کے نگہبان ہوئے!

وزیرآغا کو سائنسی انکشافات اور طبیعات کے مضمون سے بڑی دلچسپی ہے۔طبعیات پر ان کی معلومات اتنی تازہ ترین ہے کہ میرے ایک عزیز اور طبیعات کے پروفیسر ادریس احمد اس بارے میں بار بار حیرت کا اظہار کرتے رہے ہیں اور تا حال ان کی حیرت ختم نہیں ہوئی۔

جو لوگ مختلف علوم کے ادب کے ساتھ ربط کی نوعیت کو جاننا چاہتے ہیں انہیں وزیرآغا کی کتب ضرور پڑھنی چاہئیں اور طلب زیادہ ہو تو ملاقات بھی کرنی چاہئے۔علم کے جو ایسے دلدادہ تا حال وزیرآغا کی کتابیں نہیں پڑھ سکے یا ان سے ملاقات نہیں کر سکے ان کے بارے میں یہی کہوں گا: افسوس تم کو میّر سے صحبت نہیں رہی

اردو انشائیہ کے بانی، جدید تر نظم کے پیش رو، اردو تنقید کی منفرد اور عالمانہ آواز۔۔ڈاکٹر وزیرآغا عہد ساز شخصیت ہیں۔اپنی بعض بشری کمزوریوں کے باوجود ہمارے ادب اور ہمارے عہد کا بہت بڑا سرمایہ ہیں۔مجھے فخر ہے کہ مجھے ان سے اکتساب علم اور نیاز مندی کا شرف حاصل ہے۔

☆☆☆

ایک اُدھورا خاکہ
(غلام جیلانی اصغر)

مجھے ہر گنہ کی جزا ملی
وہ شرافتوں کی سزا میں ہے

پروفیسر غلام جیلانی اصغر سے میری پہلی ملاقات اس زمانے میں ہوئی جب وہ بھرپور جوانی گزار کے لڑکپن کی حدود میں داخل ہو چکے تھے۔ان سے ملاقات کے پہلے مرحلے میں ہی ''ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات'' والی بات مجھے پہلی بار صحیح طور پر سمجھ میں آئی۔ یہ حقیقت ہے کہ جیلانی صاحب جوانی کے بعد مزید جوان ہوئے، بڑھاپے کو ان کے دل پر قبضہ کرنے کی جرأت نہیں ہوئی۔ہم دونوں میں سب سے اہم قدر مشترک یہ تھی کہ ہم ذہنی طور پر ہمیشہ ٹین ایج میں رہے اور انشاءاللہ تادمِ مرگ ایسے ہی رہیں گے۔ذہنی عمر کی ہم آہنگی کے باعث ہم ان باتوں میں ہمیشہ ایک دوسرے کے راز دار رہے جو ایسی عمروں کا خاصہ ہوتی ہیں۔مثلاً جیلانی صاحب کو انٹر کی ایک طالبہ سے محبت ہو گئی بلکہ یوں کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ اس طالبہ کو جیلانی صاحب سے محبت ہو گئی (دراصل لڑکی بچپن سے باپ کی شفقت سے محروم تھی)۔۔ان دنوں میں جیلانی صاحب نے نہایت خشوع وخضوع سے نمازیں پڑھنا شروع کر دیں، گویا:

اس کو پانے کی تمنا یہ یقیں کب ہے مگر

ہاتھ جب اٹھ ہی گئے ہیں تو دعا ہی مانگوں

سو جیلانی صاحب دعائیں مانگتے رہے اور مجھے بھی اس محبت کے احوال سے آگاہ کرتے رہے۔۔ میں ان دنوں میں جو بھی دعا کرتا تھا، رد ہو جاتی تھی اس لئے میں زور شور سے ان کی کامیابی کے لئے دعائیں کرنے لگا۔نتیجہ میری توقعات کے عین مطابق نکلا۔۔اسی محبت کے دوران جب لڑکی انٹر کا امتحان دے رہی تھی ایک دلچسپ واقعہ ہوا۔جیلانی صاحب کو امتحانات کے دوران چیکنگ کے خصوصی اختیارات حاصل تھے انہوں نے وزیر آغا سے کار مانگی تاکہ امتحان گاہ کا دورہ کر آئیں۔آغا صاحب نے یہ شرط عائد کر دی کہ حیدر قریشی کو ساتھ لے جائیں بے شک سارا دن کار اپنے پاس رکھیں۔جیلانی صاحب نے کہا حیدر قریشی کو ساتھ لے جانے سے بہتر ہے میں خود ہی نہ جاؤں۔مجھے اپنے بھید بتانے کے بعد انہیں اب یہ احساس ہونے لگا تھا:

ذکر اس پری وش کا اور پھر بیاں اپنا
بن گیا رقیب آخر تھا جو راز داں اپنا

غلام جیلانی اصغر کی محبت کے ساتھ مجھے جوش ملیح آبادی اور قدرت اللہ شہاب دونوں یاد آتے ہیں۔جوش نے اپنی محبتوں کے اشتہار خود آویزاں کئے تھے بلکہ ان میں ڈھیر ساری رنگ آمیزی بھی کی تھی جبکہ غلام جیلانی اصغر نے اپنی محبتوں کو کبھی مشتہر نہیں کیا۔قریبی دوستوں سے بے اختیاری میں کچھ باتیں کہہ گئے تو یہ محبت کا اپنا زور ہوتا ہے مگر دوستوں سے بھی سارے رنگ چھپائے رکھے صرف بلیک اینڈ وائٹ ہی ظاہر کئے۔قدرت اللہ شہاب چندراوتی کے عشق میں مسجد تک چلے گئے۔گناہ کی توفیق مانگنے کے لئے لفظوں کے بہانے ڈھونڈتے رہے اور پھر وہاں سے بھاگ نکلے۔۔غلام جیلانی اصغر نے خدا سے ہیرا پھیری کی کوشش نہیں کی۔بڑے صاف، سلیس اور سادہ لفظوں میں بے تکلفی سے خدا سے کچھ یوں دعا مانگی:

مولا! مجھ میں گناہ کرنے کی صلاحیت ختم ہو چکی ہے۔مجھے یہ صلاحیت عطا کر، پھر گناہ کرنے کی توفیق دے اور اس کے بعد میرے گناہ کو معاف بھی کر دے۔بے شک تو غفور الرحیم ہے!

ادبی لحاظ سے جیلانی صاحب ہمہ جہت شخصیت کے مالک ہیں۔شاعر،انشائیہ نگار،مزاح نگار۔۔ان تمام اصناف میں جیلانی صاحب کی شخصیت کا ایک وصف بہت نمایاں ہے اور وہ ہے ان کے مزاج کی شگفتگی اور تازگی۔۔ان کے انشائیوں میں شگفتگی کا عنصر قدرے زیادہ ہوتا ہے اس لئے انشائیہ کے مخالفین نے ان کے انشائیوں کو حوالہ بنانا چاہا لیکن جیلانی صاحب نے الگ سے طنزیہ مزاحیہ مضامین لکھ کر طنز ومزاح اور انشائیہ کے بنیادی فرق کو خود ہی واضح کر دیا۔

جیلانی صاحب کا شعری مجموعہ ''میں اور میں'' شائع ہوا تو ہاتھوں ہاتھ بک گیا۔اس مجموعے کی فروخت کے سلسلے میں بعض لطیفے بھی مشہور ہوئے جن میں سب سے عمدہ لطیفہ مشفق خواجہ نے گھڑا تھا۔اس لطیفے کے مطابق جیلانی صاحب نے اپنے پرانے شاگردوں کو اپنا شعری مجموعہ حکماً فروخت کیا۔اس لطیفے میں مزید اضافہ یہ ہوا کہ جب کتاب کی ایک ہی جلد باقی رہ گئی،وہ ہمیشہ جیلانی صاحب کی بغل میں رہتی۔جہاں کوئی پرانا شاگرد نظر آتا اس سے پوچھتے تم نے میرا شعری مجموعہ دیکھا ہے۔جواب نفی میں ملتا تو کتاب اس کے ہاتھ میں تھماتے اور کہتے چلو نکالو ایک سو روپیہ۔۔جب رقم وصول کر لیتے تو پھر کہتے میاں تم تو شاعری سے کوئی رغبت ہی نہیں رکھتے پھر یہ کتاب تمہارے کس کام کی۔لاؤ کتاب مجھے واپس کر دو۔۔بقول کسے جیلانی صاحب نے ۹۹۹ کتابوں سے اتنی رقم نہیں کمائی جتنی اپنے مجموعہ کی آخری جلد سے کمالی۔۔خیر یہ لطیفہ تو لطیفے کی حد تک تھا۔حقیقت یہ ہے کہ جیلانی صاحب اپنی ادبی کتابوں کی اشاعت کے معاملے سے ہی لاتعلق ہیں۔اسکے برعکس وہ ٹیکسٹ بک بورڈ کی کتابوں کی اشاعت میں زیادہ دلچسپی رکھتے ہیں کیونکہ اس میں انہیں مناسب معاوضہ اور خاطر خواہ رائلٹی مل جاتی ہے۔دراصل غلام جیلانی اصغر اپنے دو بزرگوں کی دو مختلف نصیحتوں کے درمیان پھنسے ہوئے ہیں۔ماں نے تاکید کی تھی کہ لفظ خون کی صداقت کے سچے امین ہونے چاہئیں۔باپ نے سمجھایا تھا کہ اگر لفظ لکھو گے تو بھوکے مرو گے۔سو جیلانی صاحب نے اپنی ادبی تخلیقات کی صورت میں ماں کی نصیحت پر عمل جاری رکھا اور ٹیکسٹ بک بورڈ کی کتابوں کی صورت میں باپ کی تنبیہ کو مدِنظر رکھا۔یوں ماں باپ کے الگ الگ اور متضاد فکر کے تھپیڑوں میں پرورش پانے والا ننھا جیلانی آج بھی کشمکش میں مبتلا ہے

اور ماں باپ دونوں کو راضی رکھنے کی کوشش میں لگا ہوا ہے۔

جیلانی صاحب میں جو ذہانت،حاضر جوابی اور شگفتگی پائی جاتی ہے وہ عصر حاضر کے اردو کے چند ادیبوں کو ہی نصیب ہوئی ہے۔ان کے طنز میں زہریلا پن اور مزاح میں پھکڑ پن نہیں ہوتا۔کئی بار خود کو ہی اپنے جملوں کی زد پر رکھ لیتے ہیں۔ایک دفعہ وزیر آغا کے ہاں قدرے تاخیر سے پہنچے۔آتے ہی معذرت کرنے لگے کہ خضاب لگا رکھا تھا اس لئے دیر ہو گئی۔پھر خود ہی کہنے لگے یار داڑھی سیاہ ہونے نہ ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے۔بس بندے کا دل سیاہ ہونا چاہئے۔

جب جیلانی صاحب تلہ گنگ کالج کے پرنسپل بن کر گئے وہاں اسلامیات کے ایک پروفیسر کو ان کی آمد گراں گزری کیونکہ وہ خود پرنسپل بننے کے خواہاں تھے۔جیلانی صاحب کی خوبصورت اور چھوٹی سی داڑھی کے باعث پروفیسر صاحب مذکور نے طلبہ میں یہ بات پھیلا دی کہ جیلانی صاحب قادیانی ہیں۔طلبہ کی کھسر پھسر جیلانی صاحب تک پہنچی تو انہوں نے دو لڑکوں کو روک لیا اور پوچھا کہ کیا مسئلہ ہے؟لڑکوں نے ہچکچاتے ہوئے کہا:

سر!سنا ہے آپ قادیانی ہیں؟

جیلانی صاحب نے شگفتگی کے ساتھ جواب دیا:''میں قادیانی نہیں ہوں۔سکھ ہوں بس ذرا داڑھی چھوٹی کرالی ہے''۔دونوں طالب علم یہ سن کر ہنسنے لگے اور اسی لمحے جیلانی صاحب کے اندر کا بارعب پرنسپل باہر آ گیا''تمہیں یہ بات کس نے کہی ہے؟''

لڑکوں کی ہنسی کو بریک لگ گئی اور بوکھلاہٹ میں انہوں نے پروفیسر موصوف کا نام بتا دیا۔چنانچہ دوسرے دن پھر وہ پروفیسر کالج میں نہیں آ سکے۔ان کے ٹرانسفر آرڈر سرگودھا سے منگوا کر راتوں رات ان کے گھر پہنچا دیئے گئے۔

ایک دفعہ میں وطن عزیز کی تشویشناک صورتحال کا ذکر کر کے دکھ کا اظہار کر رہا تھا۔اسی دوران میں نے جیلانی صاحب سے پوچھا جیلانی صاحب اس ملک کا کیا بنے گا؟۔۔جیلانی صاحب بولے یہ سوال صرف تمہارے جیسے بے روزگار یا میرے جیسے ریٹائرڈ لوگ ہی کر سکتے ہیں وگرنہ ہر شخص یہاں جائز ناجائز ہر طریقے سے جائیداد بنانے میں لگا ہوا ہے اور اس کار خیر میں

اتنا منہمک ہے کہ اسے یہ سوال سننے کی بھی فرصت نہیں ہے۔۔من حیث القوم ہم جس حرص و ہوس میں مبتلا ہیں جیلانی صاحب کی بات میں اس کی واضح نشاندہی موجود ہے لیکن کسی کو اس پر غور کرنے کی فرصت بھی ہو۔اب تو مجھے بھی مزید غور کرنے کی فرصت نہیں ہے۔

میں نے جیلانی صاحب کو کبھی افسردہ اور غمگین نہیں دیکھا۔محفلیں ادبی ہوں یا نجی۔۔ جیلانی صاحب روح رواں کا درجہ رکھتے ہیں۔ان سے مل کر، ان کی باتیں سن کر زندہ رہنے کا حوصلہ ملتا ہے۔۔ان کا جواں سال بیٹا اپنی شادی کے دسویں دن فوت ہو گیا ہم لوگ سکتے میں آ گئے مگر جیلانی صاحب کسی گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے۔میں نے تنہائی میں ان کے دکھ کو کریدنا چاہا مگر ان پر کچھ اثر نہ ہوا اپنے اندر کے دکھ کے طوفان کو اندر ہی سمیٹے ہوئے وہ کسی شانت سمندر کی طرح لگ رہے تھے۔میں نے زخموں کو چھیڑا تو صرف اتنا کہا: مجھے بیٹے کی موت سے زیادہ اپنی بیوہ بہو کا دکھ ہے۔میرا بیٹا خدا کی امانت تھا،اس نے لے لیا مگر اس بے چاری کو خدا نے کیوں سزا دی ہے۔میرے بیٹے کو خدا شادی کے دس دن بعد بلانے کی بجائے شادی سے پہلے ہی بلا لیتا۔اس لڑکی کو تو روگ نہ لگتا۔

بات پرانی اور پامال سہی مگر پھر بھی حقیقت ہے کہ عموماً محفلوں میں زیادہ ہنسنے ہنسانے والے لوگ اندر سے بہت دکھی ہوتے ہیں۔اپنے دکھوں کو چھپانے کی کوشش میں وہ لوگوں میں مسرّتیں بانٹتے چلے جاتے ہیں۔جیلانی صاحب بھی ایسے ہی دکھی مگر زندہ دل انسان ہیں۔علم و فضل کے لحاظ سے ان کا اپنا ایک مقام ہے۔ماہر تعلیم کی حیثیت سے ان کا فرمایا ہوا مستند ہے۔ان کے ادبی مرتبے کو مخالفین بھی احترام کی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ان کے متعدد شاگرد ملک کے اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں اور ان کا بے حد احترام کرتے ہیں۔اگر لاہور کے بعض ادیبوں کی طرح غلام جیلانی اصغر اپنے وسائل کو بروئے کار لائیں، اپنی پبلک ریلیشنگ سے فائدہ اٹھائیں تو ملک کا سینٹیر بننا ان کے لئے کوئی مسئلہ نہیں اور کچھ بھی نہیں تو اکادمی ادبیات کی چیئرمین شپ تو گویا گھر کی بات ہے مگر افسوس کہ وزیر آغا کی طرح غلام جیلانی اصغر بھی بڑے ہی بے نیاز قسم کے انسان ہیں۔مزید افسوس یہ کہ دونوں صاحبان نے اپنے مزاج کے اثرات مجھ پر بھی مرتب کئے اور یوں مجھے بھی بے

نیازی کی دولت بخش کر دنیا و آخرت میں خوار کرایا ہے۔

جیلانی صاحب کے بارے میں جو کچھ میں نے لکھا ہے دراصل لکھنے کی کوشش کرنا ہے۔یہ ایک ادھورا سا خاکہ ہے۔بہت ہی ادھورا سا۔۔مجھے خود احساس ہے کہ جیلانی صاحب کی شخصیت کے ساتھ پورا انصاف نہیں کر سکا۔جیلانی صاحب قلم کی گرفت میں آئیں تو ان کی شخصیت منعکس ہو سکے۔وہ تو بس ہوا کے جھونکے کی طرح ہیں۔اپنے ہونے کا، اپنی موجودگی کا، اپنی خنکی کا احساس تو دلاتے ہیں مگر ہاتھوں میں ہاتھ نہیں دیتے۔

شاید میں کبھی اس ادھورے خاکے کو پورا کر سکوں!

☆☆☆

بلند قامت ادیب

(اکبرحمیدی)

تیری لگن میں تجھ سے بھی آگے نکل گئے
تیرے مسافروں کو ٹھہرنا نہ آسکا

اکبرحمیدی سے میری ملاقات اور تعلق کی نوعیت تھوڑی پیچیدہ ہے۔ یہ پیچیدگی میری اپنی پیدا کردہ ہے۔ میں اکبرحمیدی کے بنائے ہوئے یا دکھائے ہوئے سیدھے رستے پر چلتا ہوں پھر اس رستے کو، سیدھے سادے رستے کو الجھا کر بھول بھلیّاں سی بنا لیتا ہوں یوں میرے لئے اچھی بھلی بامعنی منزلیں بھی بے معنی ہو جاتی ہیں۔ اکبرحمیدی کی تقلید کا سلسلہ پتہ نہیں کہاں سے شروع ہوا تھا۔ فی الوقت جو سرا ہاتھ آ رہا ہے اس کے مطابق اکبرحمیدی کے ہاں پہلی بیٹی پیدا ہو چکی تھی اور میرے ہاں بھی پہلی بیٹی پیدا ہو چکی تھی۔ پھر اکبرحمیدی کے ہاں ایک بیٹا پیدا ہوا جس کا نام انہوں نے شعیب رکھا۔ چنانچہ میں بھی جلد ہی ایک بیٹے کا باپ بن گیا اور اس کا نام شعیب رکھ دیا۔ پھر اگلے برس ایک اور بیٹا ہوا اس کا نام عثمان رکھ دیا اسی دوران اکبرحمیدی کے ہاں ایک بیٹا ہو گیا جسے وہ پیار سے ٹیپو کہتے ہیں۔ اگر انہوں نے اپنے بیٹے کا نام عثمان رکھ لیا ہوتا تو ہمارا کوئی جھگڑا نہ تھا لیکن جب انہوں نے ٹیپو نام رکھ لیا تو مجھے بھی رواں ہونا پڑا۔ چنانچہ میرے ہاں تیسرا بیٹا پیدا ہوا جسے ہم سب پیار سے ٹیپو کہتے ہیں۔ چونکہ میں رواں ہو چکا تھا اس لئے بریکیں لگنے تک ایک اور بیٹی پیدا ہو گئی۔ اب اکبرحمیدی ایک بیٹی اور دو بیٹوں کے باپ ہیں اور میں دو بیٹیوں اور تین بیٹوں کا باپ ہوں۔ اکبرحمیدی نے ایک عرصہ تک اپنے آبائی علاقے میں رہ کر چھوٹی موٹی نوکری کی۔ میں نے بھی انیس سال اپنے آبائی علاقے میں مزدوری کر کے

گزار دیئے۔ پھر اکبرحمیدی درس و تدریس کے شعبے سے منسلک ہو کر اسلام آباد جیسے صحت افزا مقام پر چلے گئے تو میں بھی درس و تدریس کے شعبے سے منسلک ہو کر اسلام آباد سے بھی ساٹھ ستر میل آگے ایبٹ آباد جیسے صحت افزا مقام پر پہنچ گیا اور صحت افزا مقام کے حوالے سے جب وہاں بھی چین نہ آیا تو یورپ کے ایک ملک جرمنی میں پہنچ گیا۔

یہ نجی زندگی سے چند مثالیں تھیں ادبی زندگی کی طرف دیکھتا ہوں تو وہاں بھی کچھ ایسی ہی صورتحال دکھائی دیتی ہے۔ اکبرحمیدی نے غزلیں کہیں۔۔ میں نے بھی غزلیں کہنا شروع کر دیں۔ اکبرحمیدی نے منہ کا ذائقہ بدلنے کے لئے چند نظمیں کہیں تو میں بھی نظم نگاری کی طرف مائل ہو گیا۔ اکبرحمیدی نے انشائیہ نگاری شروع کی تو میں نے بھی دھیمی رفتار سے سہی، انشائیے لکھنے شروع کر دیئے۔ اکبرحمیدی نے غلطی سے ایک دو افسانے لکھ لئے۔ میں نے جوابی کاروائی کے طور پر افسانوں کا ایک مجموعہ چھپوا لیا اور دوسرا مجموعہ ترتیب دے رہا ہوں۔ اکبرحمیدی نے اپنے چند بزرگوں کے خاکے لکھے تو میں نے بھی اپنے بزرگوں کے خاکے لکھنے شروع کر دیئے۔ یہ خاکے کیا تھے قبیلہ قریش اور جاٹوں کے درمیان جنگ کا اعلان تھا۔ اکبرحمیدی نے اپنے بعض عزیزوں کی چند خوبیاں بیان کیں، میں نے اپنے عزیزوں میں ان سے دس گنا زیادہ کمالات دکھا دیئے۔ اکبرحمیدی نے اپنے بعض عزیزوں کی چند خامیاں بڑے سلیقے سے بیان کیں، میں نے اپنے بعض عزیزوں میں اس سے زیادہ سلیقے کے ساتھ ہزار کیڑے ڈال دیئے۔ آخر اکبرحمیدی کو ہار ماننا پڑی انہوں نے اپنے عزیز واقارب کے خاکے لکھنے بند کر دیئے، ویسے اب سوچتا ہوں کہ قبیلہ قریش اور جاٹوں کی جنگ تو شاید جاٹ ہی جیت گئے ہیں کیونکہ میرا اپنا ننہال جاٹ باجوہ خاندان ہے اور اپنے عزیزوں کے دس خاکوں میں سے چار خاکے تو خود میں نے جاٹوں کے لکھ دیئے ہیں۔

اس قبائلی جنگ اور اس کے نتیجے سے قطع نظر اکبرحمیدی اور میں تقریباً تمام اصناف ادب میں ایک دوسرے کے مدمقابل ہیں اس کے باوجود ہماری دوستی نہ صرف قائم ہے بلکہ بے حد مضبوطی کے ساتھ قائم ہے۔ ''انجمن ستائش باہمی'' کے اس دور میں مجھ سے بار ہا زیادتیاں ہوئی ہیں۔ مثلاً ''اوراق'' میں اکبرحمیدی کا خصوصی گوشہ شائع ہوا تو مجھے بیحد خوشی ہوئی۔ اس کے مندرجات کے

حوالے سے میں مدیر ''اوراق'' کو سچے دل سے ایک توصیفی خط لکھنا چاہتا تھا لیکن پھر خیال آیا کہ یار لوگ کہیں گے دونوں دوست ہیں اس لئے تعریف کی جارہی ہے۔ چنانچہ میں نے اکبر حمیدی کو اپنے تاثرات سے آگاہ کر دیا لیکن ''اوراق'' میں چپ ہو رہا۔ مختلف جرائد میں ان کی تخلیقات چھپتی ہیں تو ان کے بارے میں انہیں جرائد ہی میں۔۔ میں نے اپنے تاثرات کا اظہار بھی کیا ہے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ بہت سے مواقع پر حجاب مانع رہا۔

ایک رسالہ میں اکبر حمیدی کی ایک خوبصورت غزل چھپی۔ (تب) پشاور سے چھپنے والے اس رسالے کی خوبی یہ رہی ہے کہ اس میں جتنے صفحات ادبی تخلیقات کے لئے ہوتے ہیں لگ بھگ اتنے صفحات قارئین کے خطوط کے لئے وقف ہوتے ہیں۔ اکبر حمیدی کی غزل چھپنے کے بعد رسالہ مذکور کا اگلا شمارہ آیا تو مدیران کی تعریف سے لبریز خطوط میں سے کسی میں بھی اکبر حمیدی کی اس غزل کے بارے میں کسی رائے کا اظہار نہیں کیا گیا تھا۔۔ میں ایبٹ آباد سے اسلام آباد گیا تو اکبر حمیدی کی اس غزل کی تعریف کی اور خاص طور پر یہ شعر دہرایا:

علم نے یوں نہ کیا تھا مرے دل کو پتھر
کوئی سچ کہتا تو میں مان لیا کرتا تھا

اکبر حمیدی کہنے لگے یار! اس رسالے میں تو لگتا ہے کسی کو بھی غزل پسند نہیں آئی۔ تب میں نے انہیں کہا کہ خاص طور پر اس رسالے کے قارئین کی رائے سے کبھی اثر نہیں لیں، بلکہ اس کے قارئین کی اکثریت جس غزل کو زیادہ پسند کرے اس پر احتیاطاً نظر ثانی کر لیا کریں۔۔ بحیثیت، شاعر مجھے اکبر حمیدی کی غزلیں بہت اچھی لگتی ہیں۔ ایک خاص زاویۂ نگاہ سے بات کروں تو عبید اللہ علیم، صابر ظفر اور اکبر حمیدی میں سے عبید اللہ علیم کی شاعری over confidence کا شکار ہو چکی ہے۔ صابر ظفر جذبہ اور تخیل کی اہمیت کو فراموش کر کے عروضی تجربات کی شاعری کرنے لگے ہیں جبکہ اکبر حمیدی کے ہاں جذبہ، تخیل اور عروضی مہارت کے امتزاج سے شاعری جنم لیتی ہے اور اکبر حمیدی اپنی سادگی اور انکساری کے باعث مسلسل خوب سے خوب تر کی طرف گامزن ہیں۔

بحیثیت انشائیہ نگار اکبر حمیدی نے انشائیہ کے مزاج کو پوری طرح سے سمجھا ہے۔ ان کے

انشائیے، انشائیہ کے مزاج سے پوری طرح ہم آہنگ ہونے کے باوجود مروّجہ انشائیہ سے اپنی ایک الگ پہچان رکھتے ہیں۔ انشائیہ اور مزاحیہ کے فرق کو واضح کرنے کے لئے اور کچھ منہ کا ذائقہ بدلنے کے لئے انہوں نے مزاحیہ ریڈیو کالم بھی لکھے۔ ان کے خاکوں کی اپنی ایک شان ہے۔ مولوی عبدالحق سے محمد طفیل تک خاکہ نگاری کا ایک دور رہا۔ پھر یہ صنف ادیب نما صحافیوں کے ہتھے چڑھ گئی۔ انہوں نے شخصیت کی خاک اڑانے کو ہی خاکہ نگاری سمجھ لیا اور کشتوں کے پشتے لگا دیئے۔ خاکہ نگاری کی ایسی آلودہ فضا میں اکبر حمیدی کے خاکے سرسبز پیڑوں کی طرح ادبی آلودگی کو ختم کرنے میں معاون ثابت ہو رہے ہیں۔ انہوں نے ثابت کر دکھایا ہے کہ خاکہ نگاری نہ تو شخصیت کی خاک اڑانے کا نام ہے اور نہ شخصیت پر خاک ڈالنے کا۔۔ بلکہ یہ تو پل صراط پر سے گزرنے کا عمل ہے جبکہ ادیب نما صحافیوں کے خاکے سرکس کے رسوں پر چلنے کا منظر دکھاتے ہیں۔ شاعر، انشائیہ نگار، خاکہ نگار، مزاح نگار۔۔ اتنا کچھ ہونے کے باوجود اکبر حمیدی نے تنقید کا خانہ بھی خالی نہیں رہنے دیا۔ حال ہی میں ان کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ ''مضامین غیب'' چھپ کر آیا ہے۔ یہ کتاب ابھی مجھ تک نہیں پہنچی تاہم مروّجہ تبصرہ نگاری کے مطابق میں یہ بات وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ علم غیب سے دلچسپی رکھنے والے اصحاب اس کتاب کو ہاتھوں ہاتھ لیں گے۔ اکبر حمیدی طبعاً ایک سیدھے سادے، سچے، کھرے اور صاف گو دیہاتی ہیں۔ انہیں ہیرا پھیری اور چالاکی نہیں آتی تھی۔ کھلی دوستی اور کھلی دشمنی۔ لیکن شہر کے بعض دوستوں اور مہربانوں کی مکاریوں اور ہیرا پھیریوں کا شکار ہوتے ہوتے آخر انہیں بھی تھوڑی بہت ہیرا پھیری اور چالاکی کرنا آ گئی ہے۔۔ میں سمجھتا ہوں کسی مکّار کی مکّاری کا مقابلہ کرنے کے لئے تھوڑی بہت دھوکہ دہی اور مکّاری سے کام لینے میں کوئی حرج نہیں ہوتا۔ سو اکبر حمیدی نے اگر کہیں تھوڑی بہت چالاکی سے کام لیا ہے تو صرف مکار لوگوں کے سامنے۔ اپنے دوستوں کے لئے تو وہ ہمیشہ سے سیدھے، سچے اور صاف اکبر حمیدی ہیں۔

ایک دفعہ اکبر حمیدی مجھ سے کہا:

یار حیدر قریشی! ادب کو تمہارے شر سے کیسے محفوظ رکھا جا سکتا ہے؟۔۔

میں نے کہا آپ لکھنا چھوڑ دیں، میں بھی لکھنا چھوڑ دوں گا۔صرف اسی صورت میں ہی ادب کو میرے شر سے محفوظ رکھا جاسکتا ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ میں نے ادب کی مختلف اصناف میں اکبر حمیدی سے اتنا اثر لیا ہے کہ اب با قاعدہ طور پر ان کے ''متاثرین'' میں شمار کیا جانا چاہتا ہوں۔

☆☆☆

صاف گو ادیبہ

(عذرا اصغر)

ہم تہی دست آبروئے فقر
سود دے کر زیان مانگتے ہیں

لڑکپن کے جذبات میں گھری ہوئی ایک لڑکی کا قصہ ہے۔وہ لڑکی اپنے اردگرد موجود زندگی کے کرداروں کو غور سے دیکھتی پھر اپنے کچے پکے احساسات میں ان کرداروں کو گوندھ کر ان کی کہانیاں بنانے کی کوشش کرتی۔اس کوشش میں کبھی اس لڑکی کے اپنے آنسوؤں کا پانی اتنا زیادہ پڑ جاتا کہ کہانی کے نقش ہی نہ بن پاتے اور کبھی پانی اتنا کم ہوتا کہ کہانی بھربھرا کر رہ جاتی۔اس کے باوجود اس لڑکی نے سیکھنے کا عمل اور ریاضت جاری رکھی اور آخر کار ایک دن اپنے والد کی شخصیت کو سامنے رکھ کر ایک کہانی بنانے میں کامیاب ہوگئی۔حوصلہ افزائی کی امید کے ساتھ یہ کہانی بڑی بہن کو دکھائی لیکن وہاں سے سخت ڈانٹ پڑی۔بھائی سے شاباش ملنے کی توقع تھی وہ بھی پوری نہ ہوئی۔حوصلہ شکن حالات کے باوجود اس لڑکی نے ہار نہیں مانی۔آنکھیں جو کچھ دیکھتیں اسے ذہن اور دل کے حوالے کر دیتی اور کچھ عرصہ کے بعد اسے اپنے اندر سے کہانی کی صورت میں نکال لیتی۔اس طرح اس نے کئی کہانیاں لکھیں، یہی اس کے لڑکپن کی محبت تھی۔اپنی کہانیوں کو سب سے چھپا کر رکھنا شروع کر دیا۔اسی دوران وہ لڑکی لڑکپن کی دہلیز عبور کر کے جوان ہوئی اور پھر خاندان کے دستور کے مطابق پیا کے دیس سدھار گئی۔پیا کے دیس جا کر اسے پتہ چلا کہ اس کے پیا کو شاعری کا شوق ہے۔اس خبر نے جیسے لڑکپن کی محبت کو پھر سے بیدار کر دیا۔حوصلہ کر کے اس لڑکی نے اپنے پیا جی کو دبے دبے لفظوں میں اپنی افسانہ نگاری کی

اطلاع دی۔شاعر پیا اس خبر سے نہال ہوگئے گویا ان کے گھر میں شاعری اور افسانے کا ملن ہو رہا تھا۔انہوں نے اس کی حوصلہ افزائی کی۔اس کے اندر کی افسانہ نگار کو ابھارا،سنوارا۔۔اور پھر وہ لڑکی اردو ادب میں ایک افسانہ نگار کی حیثیت سے سامنے آنے لگی۔اس لڑکی کا نام عذرا تھا اور اس کے پیا جی اصغر مہدی تھے،سو یوں اردو دنیا کو اصغر مہدی کے وسیلے سے عذرا اصغر جیسی افسانہ نگار ملی۔

عذرا اصغر کو افسانہ نگاری کے سلسلے میں مائیکے میں جس کٹھن کا شکار ہونا پڑا اسکے نتیجے میں انہوں نے اپنے گھریلو ماحول کو بالکل ہی ادبی بنا کر رکھ دیا۔ادبی یوں کہ گھر،گھر نہیں لگتا کسی ادبی انجمن کا دفتر لگتا ہے۔عذرا افسانہ نگار، اصغر مہدی شاعر، شبہ طراز شاعرہ بھی اور مصورہ بھی۔ بیٹا امبر بھی فکشن سے دلچسپی رکھتا ہے۔ایک سفر نامہ اور چند کہانیاں لکھ چکا ہے۔اس خاندانی صورتحال کے باوجود بھی گھر تھوڑا سا گھر دِکھتا تھا۔سو اس کمی کو دور کرنے کے لئے یا پورا کرنے کے لئے انہوں نے ’’تجدید نو‘‘ کے نام سے ادبی رسالہ نکال لیا اور مزید احتیاط کے طور پر ’’تجدید اشاعت گھر‘‘ کے نام سے ایک اشاعتی ادارہ بھی قائم کر لیا تاکہ گھر اشاعت گھر لگے، یوں عذرا اصغر نے اپنے گھر کو ادب کے گودام میں بدل دیا۔تجدید اشاعت گھر ایسا ادارہ ہے جہاں میرے جیسے لوگوں کی کتابیں چھپتی ہیں۔ مجھے علم ہے کہ راولپنڈی اور لاہور کے بعض ناشر ادیبوں سے پچاس پچاس ہزار روپے (بعض اوقات اس سے زیادہ بھی) نقد لے کر ان کی کتابیں چھاپتے ہیں۔ یوں مجھے اپنے ناشر کی خیر خواہی کے جذبے کے تحت کچھ نہ کچھ ضرور کرنا چاہئے تھا لیکن وہ ادب کی بے لوث خدمت کرنے پر تُلی ہوئی تھیں تو مجھے ان کے خلوص کو خراب کرنے کا کیا حق پہنچتا تھا۔ بلکہ میری تو دعا ہے کہ ’’ادب کی بے لوث خدمت‘‘ کرنے کا انکا یہ جذبہ ہمیشہ سلامت رہے۔

عذرا اصغر ایک عرصہ تک ’’تخلیق‘‘ لاہور کی مجلس ادارت میں شامل رہیں اس زمانے میں ہی میں نے خانپور سے ’’جدید ادب‘‘ کا اجرا کیا۔تب خانپور کے ایک نیم پاگل افسانہ نگار نے اپنی طرف سے بنا کر پتہ نہیں ایڈیٹر تخلیق کو میرے حوالے سے کیا کچھ لکھ مارا۔ایک مرحلے پر مجھے معلوم ہوا کہ ادارہ تخلیق مجھ سے ناراض ہے۔میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ کسی مخالف نے ایسا پاگل

پن کیا ہوگا۔ مدت بعد اس شرارت کا علم ہوا۔ میں نے وضاحت کرنا چاہی تو عذرا اصغر نے فوراً کہا وضاحت کی ضرورت ہی نہیں۔’’اُن حضرت‘‘ کی کارستانیاں تو ساری ادبی دنیا جانتی ہے اور ان کے کئی لطیفے بھی مشہور ہو چکے ہیں۔

اظہر جاوید سے اصغر مہدی اور عذرا اصغر کے گھریلو مراسم ہیں۔شِبہ کو لاہور میں کوئی پرابلم ہو تو اظہر جاوید سے رہنمائی حاصل کرتی ہے۔ادھر اظہر کی بیٹی جو اسلام آباد کے قریب ہی مقیم ہے اس کی دیکھ بھال کا فریضہ اصغر کو ادا کرنا ہوتا ہے۔’’تخلیق‘‘ کے زمانہ ادارت میں اظہر جاوید اور عذرا اصغر میں ایک دوستانہ اختلاف رہتا تھا۔ عذرا اصغر کا خیال تھا کہ کوئی خاتون اگر افسانہ نگار یا شاعرہ نہیں ہے تو اسے خود لکھ لکھ کر دینے اور چھاپنے کا عمل ادبی زیادتی اور ظلم ہے جبکہ اظہر جاوید کے نزدیک یہ غالباً اظہارِ محبت یا اشتہارِ محبت ہوتا ہے۔ایک دفعہ میں نے عذرا سے کہا اظہر کی فلاں نظم سے سندھ کی ایک بی بی چھلکی پڑ رہی ہے۔ جواب ملا: اظہر کا تو یہ حال ہے کہ کوئی لڑکی اس کے دفتر کے سامنے سے گزر جائے، اچھی لگ گئی تو اس پر بھی غزل ہو جائے گی۔ پہلے میرا خیال تھا کہ میرے اور اظہر جاوید کے معاملات بہت ملتے جلتے ہیں لیکن بعد میں پتہ چلا وہ مجھ سے زیادہ مظلوم ہیں کیونکہ خانم کی خ کا نقطہ نیچے لانے میں انہوں نے اپنی آدھی سے زیادہ عمر بِتا دی۔

اسلام آباد آنے کے بعد عذرا اصغر نے ’’تخلیق‘‘ کی نمائشی ادارت کرنے کی بجائے اپنا رسالہ ’’تجدید نو‘‘ جاری کیا۔’’تخلیق‘‘ پر اظہر جاوید کی چھاپ تھی۔اب ’’تجدید نو‘‘ پر عذرا اصغر کی اپنی چھاپ ہے۔’’تخلیق‘‘ اور ’’تجدید نو‘‘ کے فرق سے اظہر جاوید اور عذرا اصغر کے مزاجوں کا فرق معلوم کیا جا سکتا ہے۔ عذرا صاف گو، دوٹوک بات کرنے والی اور سیدھی سادی ہیں۔ جسے سچ سمجھا بے دھڑک کہہ دیا۔ جس طرح ’’تجدید نو‘‘ اپنی اچھائیوں اور کتابت کی غلطیوں سمیت اپنا ایک تاثر رکھتا ہے۔ایسا ہی عذرا اصغر اپنی سادگی اور صاف گوئی کا ایک تاثر رکھتی ہیں۔ان کے برعکس اظہر جاوید ادبی دنیا کی اونچ نیچ سے بخوبی واقف ہیں۔’’تخلیق‘‘ کے صفحات پر متحارب دھڑوں کو ساتھ ساتھ رکھتے ہیں۔زندگی کے وار سہتے سہتے انہوں نے زندگی گزارنے کا ہنر سیکھ

لیاہے۔عذرااصغر یہ ہنر کبھی نہیں سیکھ سکیں گی۔

عذرا اصغر کی سادگی اور صاف گوئی کاایک واقعہ یاد آرہا ہے۔فیصل آباد سے کسی لڑکی نے تجدید کے لئے ایک مضمون بھیجا یہ مضمون ایک ایسے صاحب کے بارے میں تھا جنہوں نے ادب کو صحافت کے مقام پر لاکھڑا کیا ہے۔ اچھے بھلے ادیب ان صاحب کا نام آتے ہی محتاط ہوجاتے ہیں۔کوئی بھی ان کی صحافیانہ دہشت گردی کا شکار نہیں ہونا چاہتا۔اسی لئے بعض معتبر قسم کے ادیب بھی اپنی سطح سے گر کراس ادیب نما صحافی کی تعریف بلکہ خوشامد کرتے ہیں اصولاً عذرااصغر کواس صحافی کی شان میں لکھا گیا مضمون چھاپ کراس کی خوشنودی حاصل کرنی چاہئے تھی لیکن انہوں نے مضمون بھیجنے والی لڑکی کو خط لکھ دیا کہ جن صاحب کے بارے میں آپ نے مضمون بھیجا ہے وہ سرے سے ادیب ہی نہیں ہیں۔ ڈنڈے کے زور سے وہ بے شک ادیب کہلاتے رہیں۔آپ کسی بھی ادیب پر مضمون بھیجیں میں ضرور چھاپوں گی لیکن میں غیرادیبوں کوادیب بنا کر پیش نہیں کرسکتی۔اس صاف گوئی کا نقصان عذرااصغر کوآخری دم تک اٹھاتے رہنا ہے۔

صاف گوئی سے بے مروّتی کا تاثر بھی پیدا ہوسکتا ہے لیکن عذرااصغر بے مروّت نہیں ہیں۔ پرانے تعلقات کی ممکنہ حدتک پاسداری کرتی ہیں۔سیدہ حنا سے ان کی پرانی دوستی ہے۔’’تجدیدنو‘‘ چھپنا شروع ہوا تو سیدہ حنا کی طرف سے تعلقات میں کھچاؤ پیدا ہوگیا۔لیکن پہلے ایک اور ضمنی بات۔۔سیدہ حنا نے پہلے تین یکساں مصرعوں کے ہائیکو لکھے تھے۔بعد میں بھید کھلا کہ ہائیکو کا اصل وزن کچھ اور ہے۔اسی دوران سیدہ حنا نے تین یکساں مصرعوں کے ماہیۓ لکھنے شروع کردیئے بدقسمتی سے مجھے وضاحت کرنا پڑی کہ ماہیۓ کا اصل وزن بھی کچھ اور ہے۔ یہ ایک ادبی معاملہ تھا اسے ادبی سطح پر ہی طے ہونا چاہئے تھا لیکن شاید یہ سیدہ حنا کی انا کا مسئلہ بن گیا۔اسی دوران ’’سلگتے خواب‘‘ چھپ گئی۔میں نے کتاب کا ایک سادہ سا اشتہار بنا کرادارہ ’’ابلاغ‘‘ کی خدمت میں کتاب کے ساتھ بھیج دیا۔ساتھ ہی لکھا کہ آپ کتاب پر تبصرہ مت چھاپیں صرف اشتہار چھاپ دیں۔کسی دوست کا دل پسیج گیا تو شاید کبھی کوئی مضمون بھی لکھ دے۔۔سیدہ حنا کواصل غصّہ تو ماہیے کے وزن کے مسئلہ پر تھا مگر انہوں نے غلط طور پر میرے خط کو آڑ بنا کرادار یے میں میری

مذمت کرڈالی اور لکھا کہ ہم اتنی محنت کر کے تبصرے لکھتے ہیں اور آپ کو مختصر تبصرے پسند ہی نہیں آتے۔ میں نے اسکے جواب میں پھرانہیں تفصیلی خط لکھا جسے انہوں نے اس طرح سنسر کر کے چھاپا کہ ان کی اصل نیت ظاہر نہ ہونے پائے۔۔جب عذرااصغر کو یہ احوال معلوم ہوئے تو وہ خاصی حیران ہوئیں۔ پھر کہنے لگیں ادار یے کا اصل پس منظر تو آپ سے معلوم ہوا ہے لیکن اگر صرف ادار یے کو ہی مدنظر رکھیں تب بھی سیدہ حنا نے آپ پر جوالزام لگایا ہے بالکل وہی جرم تو وہ خود کرچکی ہیں۔’’تجدیدنو‘‘ میں ان کی ارسال کردہ کتب پر مختصر تبصرے چھپے تو ان کا شدید برہمی کا خط آیا کہ یہ تبصرہ چھاپنے سے بہتر تھا آپ کچھ نہ چھاپتیں۔۔ یہ قصہ بتا کر عذرااصغر مسکرائیں پھر بولیں چاہوں تو میں بھی ان کا وہی برہمی والا خط چھاپ سکتی ہوں لیکن مجھے پھر بھی پرانی دوستی کا لحاظ ہے۔ اس بات سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ صاف گوئی کے باوجود عذرااصغر پرانی دوستی کا لحاظ بھی کرجاتی ہیں۔

ادیبوں اور پروفیسروں کے بھلکڑ پن کے کئی لطیفے مشہور ہیں۔کسی حدتک یہ خوبی اس طبقے میں قدرتی طور پر ہوتی ہے۔عذرااصغر کو قدرت نے اس نعمت سے کچھ زیادہ ہی نوازا ہے اس کا سب سے زیادہ فائدہ خود عذرا کو اور نقصان اصغر مہدی کو ہوا ہے۔

صاف گوادیبوں کو اپنی صاف گوئی کی بھاری قیمت چکانی پڑتی ہے۔ پی آرشب کے اس دور میں انہیں ان کے جائز حق سے بھی محروم کردیا جاتا ہے لیکن عذرااصغر اس لحاظ سے خوش قسمت ہیں کہ بحیثیت افسانہ نگار پاکستان میں ہی نہیں بھارت میں بھی مسلسل نمایاں ہورہی ہیں۔متعدد معیاری افسانوی انتخاب چھپے ہیں جن میں عذرااصغر کے افسانے شامل ہیں۔جن دنوں میں عذرااصغر ’’تخلیق‘‘ کے ادارہ میں شامل تھیں تب ’’تخلیق‘‘ میں کچھ اس قسم کا اشتہار چھپا کرتا تھا کہ اب ادب کی جو بھی تاریخ چھپے گی اس میں عذرا کا نام نمایاں ہوگا۔’’تخلیق‘‘ سے الگ ہونے کے بعداب پتہ نہیں یہ اشتہار کیوں نہیں چھپتا۔۔لیکن اس اشتہار کے نہ چھپنے کا ایک فائدہ ضرور ہوا ہے اب عذرااصغر کا نام سچ مچ افسانوی ادب کی تاریخ میں آنے لگا ہے۔

☆☆☆

دوستی کا کمبل

(سعید شباب)

جو دعا کرتے تھے الٹا ہی اثر ہوتا تھا
تیری چاہت کی دعا رب سے بچالی ہم نے

خانپور کی محدود ادبی فضا میں میرے دو ابتدائی دوست تھے، جمیل محسن اور اے کے ماجد۔۔ دونوں میرے ہم جماعت بھی رہے تھے۔ دونوں سے میری دوستی قائم رہی۔ جمیل محسن کے مجھ پر دو احسان ہیں۔ ایک احسان یہ کہ اس نے مجھے بزم فرید خانپور کے پلیٹ فارم سے اپنی ادبی زندگی کے آغاز کا موقعہ دیا اور دوسرا احسان یہ کہ مجھے سعید شباب جیسے دوست سے متعارف کرایا۔

جمیل محسن کبھی کبھار ''اُس بازار'' بھی چلا جایا کرتا تھا۔ اس کے ذریعے کئی اوٹ پٹانگ قسم کے دوستوں سے ملنا پڑا۔ ایسے ہی ایک نوجوان صراف سے بھی تعارف ہوا۔ ان دنوں گولڈن سینما خانپور کے سامنے ایک سرکس شو ہو رہا تھا۔ اس صراف نوجوان نے مجھے سرکس چلنے کی دعوت دی۔ میں نے اپنے چھوٹے بھائی اکبر کو بھی ساتھ لے لیا۔ وہاں پہنچ کر اس دوست نے کسی بہانے ہمیں سرکس کی بجائے اس کے عین سامنے واقع بازارِ حسن کی سیر کرادی۔ میں ان دنوں مروّجہ اخلاقیات کا سخت پابند تھا جس کی وجہ سے حد درجہ کا بزدل بھی تھا۔ اس بزدلی کو ہمارے سماج نے خوامخواہ شرافت کا نام دے رکھا ہے۔ چند گلیاں گھومنے تک میں خوف اور شرمندگی کے باعث پسینے پسینے ہو چکا تھا۔ اکبر کم عمری کے باعث کچھ زیادہ جانتا تو نہیں تھا لیکن ہر دروازے کو وہ پُر اشتیاق نظروں سے لپک لپک کر دیکھتا تھا۔ میرے خوف اور اصرار کے باعث ہم جلد ہی وہاں سے نکل آئے۔

میں نے بعد میں جمیل محسن سے ناراضی کا اظہار کیا کہ کیسے گندے دوست سے متعارف کرا دیا۔ اس سیاحت کے نتیجہ میں آگے چل کر مجھے ایک بڑا فائدہ اور ایک نقصان ہوا۔ فائدہ یہ ہوا کہ جمیل محسن نے اس صراف کی دوستی کی خرابی کی تلافی کے لئے سعید شباب سے متعارف کرایا۔ اور نقصان یہ ہوا کہ ایک عمر کے بعد جب اکبر کو میں نے اس کی بعض سرگرمیوں کی طرف توجہ دلائی تو اس نے دوٹوک لفظوں میں کہا کہ مجھے اس بازار میں پہلی بار لے جانے والے آپ ہی تھے۔ تب مجھے پہلی بار یہ دکھ ہوا کہ میری زندگی اس قسم کے گناہوں سے محروم کیوں رہی۔ میری بزدلی نے شرافت کا نقاب اوڑھ کر مجھے کسی گناہ کا نہ رکھا۔

سعید شباب جب پہلی بار جمیل محسن کے ساتھ مجھے ملنے آیا تو جمیل کے بیشتر اوٹ پٹانگ دوست میرے ذہن میں تھے۔ چنانچہ میں نے ان سارے دوستوں کی برہمی سعید پر اتارنے کے لئے اسے جملوں کی زد پر رکھ لیا۔ ایسے تند و تیز جملے تھے کہ سعید ان کی تاب نہ لا سکا اور اٹھ بھاگا۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ چند دن گزرے تھے کہ سعید پھر آن ٹپکا۔ اس بار میں نے جملوں میں مزید شدت پیدا کی اور سعید ایک بار پھر اٹھ بھاگا لیکن ہفتہ بھر کے بعد پھر آ گیا۔ میں نے ابھی پہلا جملہ ہی چھوڑا تھا کہ سعید ہاتھ اٹھا کر بولا: حیدر صاحب! میں نے آپ کو اچھی طرح سمجھ لیا ہے۔ آپ جتنی جملہ بازی کر سکتے ہیں کر لیں لیکن اب میں یہ دوستی نہیں چھوڑوں گا۔۔ بس پھر سعید کی دوستی مجھ پر حاوی ہوتی چلی گئی۔ باقی سارے دوست اور ان کی دوستیاں دھندلاتی گئیں اور سعید کی دوستی واضح اور روشن ہوتی چلی گئی۔ پھر دوست ہی نہیں میرے بھائی بھی پیچھے ہٹتے چلے گئے اور ان کا بدل بھی سعید شباب بنتا چلا گیا۔ ایک بار میں نے ایک چھوٹے بھائی کو کسی بات پر ڈانٹا تو اس نے ترکی بہ ترکی ایسا جواب دیا کہ پھر میں کسی بھائی کو کبھی کوئی نصیحت نہ کر سکا لیکن سعید کو میں نے ایک دو بار کسی معمولی سی غلطی کی بنا پر ڈانٹا تو اس نے اس طرح سر جھکا لیا جیسے کوئی چھوٹا بھائی، باپ جیسے بڑے بھائی کی بے جا ڈانٹ کو سعادت سمجھ کر قبول کر رہا ہو۔

سعید نے خانپور کے ادبی ماحول میں میرا بھرپور ساتھ دیا۔ میں ایک معمولی مزدور تھا اور سعید بھی میرے جیسا ہی تھا۔ ہمارے مقابلے میں جو شعرائے کرام تھے ان میں کوئی

پروفیسر تھا، کوئی بینکر، کوئی ایڈووکیٹ تھا تو کوئی کچھ اور، سماجی لحاظ سے ایسی معزز قسم کی چیزوں کے مقابلے میں ہماری کوئی حیثیت نہیں تھی۔ اس کے باوجود ہم نے جم کر مقابلہ کیا۔ مخالفین کی ساری سازشیں اور سیاستیں انہیں پر الٹ کر پڑیں۔ اگر چہ اس مقابلے میں بعض اور دوستوں نے بھی خلوص دل کے ساتھ ہمارا ساتھ دیا لیکن یہ حقیقت ہے کہ سعید باقی سارے دوستوں سے زیادہ فعال رہا۔ بینک والے شاعر دوست سے میری گہری دوستی تھی۔ دوسرے لوگ زیادہ تر اس لئے میرے مخالف ہوئے تھے کہ میں بینک والے دوست کا اتنا خیال کیوں رکھتا ہوں لیکن پھر وہی بینک والا دوست دوسروں کے ساتھ مل کر میرے خلاف محاذ کھول بیٹھا تو مجھے سخت صدمہ پہنچا۔ میں دل گرفتہ بیٹھا تھا۔ سعید آ گیا۔ میں نے اس سے اپنے دکھ کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ڈائن بھی سات گھر چھوڑ دیتی ہے۔ میرے بات سن کر سعید نے فوراً کہا کہ اگر کُل گھر ہی سات ہوں تو کیا ڈائن بے چاری بھوکی مر جائے؟

جمیل محسن کے دادا محسن بریلوی اپنے زمانہ کے ریختی گو شاعر تھے۔ جمیل نے شروع میں اپنے دادا کی نسبت سے اپنا نام جمیل بریلوی رکھا۔ ایک بار سعید نے جملہ کسا: الٹے بانس بریلی کو۔۔والی بات جمیل بریلوی کے نام سے اب سمجھ میں آئی ہے۔۔ جمیل کا موقف یہ تھا کہ وہ اپنے دادا کی نسبت قائم رکھنا چاہتا ہے۔ اس پر سعید نے اسے مشورہ دیا کہ بریلوی کے بجائے محسن کی نسبت اپنالو۔ چنانچہ پھر جمیل بریلوی نے اپنا نام جمیل محسن رکھ لیا۔

ایک بار مسجد کے لئے چندہ وصول کرنے والے پیشہ ور قسم کے ایک مولوی صاحب میری داڑھی سے دھوکہ کھا کر میرے سر ہو گئے۔ میں نے انہیں سلیقے سے ٹالنے کی کوشش کی لیکن وہ مجھے ایک اینٹ کے بدلے میں جنت میں ایک گھر کی بشارت دے کر چندہ وصول کرنے کا تہیّہ کئے ہوئے تھے۔ تب سعید نے ان صاحب سے سنجیدگی کے ساتھ کہا: مولوی صاحب! آپ کس سے چندہ مانگ رہے ہیں۔ یہ بندہ تو خود یہی کاروبار کرتا ہے۔ ان صاحب سے تو میری جان چھوٹ گئی لیکن مجھے پہلی بار یہ احساس ہوا کہ میری داڑھی نے میرا حلیہ مسجد کے لئے چندہ جمع کرنے والوں جیسا بنا دیا ہے۔

سعید کو گلوکاری کا شوق ہے۔ غزل کی گائیکی میں اس نے خاصی مہارت حاصل کی تھی۔ ایک ہارمونیم بھی خرید رکھا تھا ایک بار سعید نے بتایا کہ اس نے موسیقی کی جو تھوڑی بہت تربیت حاصل کی ہے اس کے لئے مجبوراً خانپور کے ''اُس بازار'' میں ہی جانا پڑتا تھا اور یہ کہ وہ اب بھی کبھی کبھار اُدھر چلا جاتا ہے۔ چونکہ میں اس وقت تک مخصوص سماجی اخلاقیات کا اسیر تھا اس لئے میں نے سعید کو گناہ کے باب میں عذابِ قبر سے لے کر جہنم تک ایک طویل لیکچر دے ڈالا۔ اس لیکچر کا نتیجہ یہ ہوا کہ سعید نے ہارمونیم بیچ دیا اور ''اس بازار'' میں جانے سے تائب ہو گیا۔ کبھی دوستوں نے فرمائش کی تو میز کو بجا کر ہی گانا سنا دیا۔۔ بعد میں ایک وقت آیا جب میرے دل میں کہیں اندر دبی ہوئی خواہش نے سر اٹھایا۔ اس کے لئے میں نے سعید کے پرانے تجربات سے فائدہ اٹھانے کا سوچا لیکن وہ اتنا سدھر چکا تھا کہ اس سے اس موضوع پر بات کرنا بھی کمینگی محسوس ہونے لگی۔ چنانچہ گناہ کی خواہش خود بخود حسرت میں تبدیل ہو کر اندر ہی اندر دم توڑ گئی۔

ہمارے نامۂ عمل میں کچھ بھی تو نہیں ملا
کہ بے نصیب دل اسے سیاہ بھی نہ کر سکا

اب کبھی کبھی خود کو ملامت کر لیتا ہوں۔ کاش میں نے سعید کو نیکی کا لیکچر دے کر گمراہ نہ کیا ہوتا۔ سعید شباب سرائیکی کاز سے بے حد مخلص ہے۔ سرائیکی عوام کی سیاسی اور سماجی پسماندگی دور کرنے کی جدوجہد میں سعید شباب کے جذبات سے میں بخوبی آگاہ ہوں۔ تاہم سرائیکی سے اس کی محبت پنجابی یا اردو سے نفرت کی زائیدہ نہیں ہے۔ اسے پاکستان کی ساری زبانوں سے محبت ہے۔ البتہ سرائیکی اس کی ماں بولی ہونے کے باعث اس کی پہلی محبت ہے۔ سعید نے سرائیکی میں بھی تھوڑا بہت لکھا ہے۔ ٹیلی ویژن کے سرائیکی ادبی پروگراموں میں شرکت کی ہے۔ اس کے باوجود اس کا بنیادی ادبی کام اردو میں ہوا ہے۔ کچی پکی غزلوں سے لے کر اچھی اچھی غزلیں کہنے تک سعید شباب نے اپنا سفر دھیمے دھیمے طے کیا۔ شہرت کے حصول کے لئے احمقانہ اور اوچھی حرکتیں کرنے کی بجائے اس نے خوب سے خوب تر کی جستجو جاری رکھی۔ اردو ماہیا نگاری کی جو روش پنجابی ماہیے کی روایت سے بے خبری کے باعث غلط طور پر پنپ رہی تھی اس کی نشاندہی کرنے اور

اردو میں ماہیے کے اصل وزن کے نمونے پیش کرنے میں سعید نے بنیادی کردار ادا کیا ہے۔مختلف ادبی جرائد میں ہونے والے ادبی ہنگاموں میں سعید نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ مجھے اس وقت شدید حیرت ہوئی جب بھارت کے ایک شاعر مظفر ایرج کا دوسرا شعری مجموعہ چھپ کر آیا۔اس میں اہم ادیبوں کے ساتھ سعید شباب کے تاثرات بھی چھپے ہوئے تھے۔ میں نے اپنی حیرت کو چھپاتے ہوئے سعید سے پوچھا بھائی! یہ فلیپ نگار قسم کی چیز کب سے بن گئے ہو؟۔۔سعید کی جوابی مسکراہٹ ایسی لگی جیسے کہہ رہا ہو آپ تو گھر کے مرغے کو دال برابر ہی سمجھیں گے۔تب ہی میں نے طے کیا کہ اپنے شعری مجموعہ ''سلگتے خواب'' اور افسانوی مجموعہ ''روشنی کی بشارت'' کے لئے سعید سے فلیپ کی رائے ضرور حاصل کروں گا۔ چنانچہ سعید نے دونوں کتابوں پر اپنی رائے لکھی اور جی کھول کر لکھی۔ایسی رائے جسے پڑھ کر بعض کرم فرماؤں کا خون کھول اٹھا اور میں جی ہی جی میں شرمندہ ہوتا رہا۔

''جدید ادب'' خانپور کے چند آخری شماروں میں سعید بھی مجلس ادارت میں شامل تھا۔اب اس نے نایاب پبلی کیشنز کے نام سے خانپور میں ایک ادبی اشاعتی ادارہ قائم کیا ہے۔اس کا ارادہ ہے کہ ادب کے قارئین کو سچ مچ سستی قیمت پر ادبی کتابیں فراہم کی جائیں۔

سعید نہایت وجیہہ نوجوان ہے۔حسن نظر کے ساتھ خوبصورتی کو پرکھنے کا اعلیٰ ذوق رکھتا ہے۔ پہلے اس کی شادی اپنی کزن سے ہوئی مگر بدقسمتی سے یہ شادی کامیاب نہ ہو سکی۔دوسری شادی کے لئے میں نے بھی تھوڑی سی تگ و دو کی تھی۔ملتان کی ایک فیملی کی لڑکی تھی۔سعید کی طرح وہ لوگ سرائیکی بھی تھے اور اعوان بھی۔لڑکی اچھی تھی اور پڑھی لکھی تھی۔ میں اسے ذاتی طور پر جانتا تھا،سگھڑ بچی تھی لیکن فرقہ کا اختلاف تھا۔سعید نے کاغذی کاروائی کے طور پر فرقہ کی تبدیلی کے لئے بھی رضامندی ظاہر کر دی لیکن جب اسے معلوم ہوا کہ لڑکی میں قدرتی طور پر ایک معمولی سا نقص ہے تو اس نے میرے پاؤں پکڑ لئے۔ میں نے کہا: قدرت کی طرف سے ملے ہوئے کسی عیب پر اعتراض کرنا ظلم ہے۔سعید نے اپنے دونوں کان پکڑ کر کہا خدا کی قسم میں اس کے عیب پر اعتراض نہیں کر رہا۔ میں نے کہا پھر شادی کر لو۔ثواب ہوگا۔سعید نے کہا میں تو ویسے

ہی بڑا گنہگار آدمی ہوں لیکن اس نیکی کے لئے مجھے مجبور نہ کریں۔میں نے سوچا شاید فرقہ کی تبدیلی سے گھبرا رہا ہے لیکن سعید کہنے لگا بے شک مجھے سکھ بنوا لیں مگر اس ثواب سے مجھے بچا لیں۔آخر مجھے اس کی حالتِ زار پر ترس آ گیا اور لڑکی والوں کو بہانہ بنا کر جواب دے دیا۔بعد میں سعید نے اپنے واقف کاروں میں ایک اچھی لڑکی شازیہ سے شادی کر لی۔اب دونوں بیوی اپنے بچوں سمیت ہنسی خوشی زندگی گزار رہے ہیں۔

سعید نے میرے ساتھ دوست اور بھائی کے دونوں رشتوں کو نبھایا ہے۔اس دوستی کی وجہ سے امی جی اور مبارکہ کا تعلق سعید کی امی، بہنوں اور شازیہ بھابھی سے قائم ہوا۔ابا جی کو سعید نے ہمیشہ اپنے والد جیسا احترام دیا۔بابا جی سے اس کی گپ شپ زیادہ تھی۔بابا جی کو بھی سعید سے ایک خاص اُنسیت تھی۔میرے دادا جی اور سعید کے والد خانپور کے ایک ہی قبرستان میں دفن ہیں۔میرا خیال ہے کہ سعید سے دوستی ہمارے بزرگوں کی قبروں سے لے کر ہماری اپنی قبروں تک قائم رہنے والی ہے۔سعید نے میرے ساتھ بڑی دور تک دوستی نبھائی ہے۔ میں خانپور سے جغرافیائی طور پر جتنا دور ہوتا گیا سعید کی دوستی مزید پکی ہوتی گئی۔

''از دیدہ دور از دل دور'' والی بات سعید نے عملاً غلط ثابت کر دی ہے۔



عاجزی کا اعجاز

(محمد اکبر)

مرجھا چکے ہیں پھول تری یاد کے مگر
محسوس ہو رہی ہے عجب تازگی مجھے

مدّت ہوئی گوجرانوالہ کے قریب ایک گاؤں میں ایک لڑکا اپنے غریب ماں باپ کے زیرِ سایہ پل رہا تھا۔اس لڑکے کو پڑھنے کا بہت شوق تھا۔گاؤں سے کئی میل کے فاصلے پر ایک سکول تھا۔ یہ لڑکا ایک سیکنڈ ہینڈ بائیسکل پر روزانہ اسکول آیا کرتا تھا۔ ایک دفعہ اس کی بائیسکل خراب ہوگئی۔مرمت کے لئے کل خرچہ دو روپے بنتا تھا۔دس دن تک کچھ رقم پس انداز کی گئی اور یہ دس دن وہ لڑکا کئی میل کا سفر روزانہ پیدل طے کرتا رہا۔سائیکل مرمت کرالی گئی اور مرمت کا کل خرچہ چھوٹی چھوٹی قسطوں کی صورت میں دو ماہ میں جا کر ادا ہوا۔وہ لڑکا بھیانک غربت کے دُکھ سہتا رہا لیکن اس نے اپنا تعلیمی سلسلہ جاری رکھا۔ایک دن آیا جب اسے فوج میں کمیشن مل گیا۔کمیشن ملنے پر اسے اتنی خوشی ہوئی کہ بلڈ پریشر خطرناک حد تک بڑھ گیا۔اگر ایک ذہین فوجی آفیسر نے اسے بروقت سنبھال نہ لیا ہوتا تو یہ خوشی جان لیوا ثابت ہوتی۔اس لڑکے کا نام اعجاز اکبر تھا۔ جو اَب بریگیڈیئر محمد اعجاز اکبر کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ان کے نام اعجاز کا مادہ معجزے سے بھی ہے اور عاجزی سے بھی۔معجزہ سے اس طرح کہ انتہائی عُسرت کی زندگی بسر کرنے والا لڑکا اب ایک ماہر تعلیم بھی ہے اور کروڑ پتی بھی۔لیکن ان کے نام اعجاز کا تعلق عاجزی سے بہت گہرا ہے۔طبیعت کی عاجزی اور انکسار نے ہی شاید یہ معجزہ دکھایا ہے کہ وہ اب ایک

کامیاب زندگی گزار رہے ہیں۔

آرمی برن ہال پبلک سکول ایبٹ آباد میں انہیں پرنسپل بنا کر بھیجا گیا۔یہیں بریگیڈیئر کا عہدہ ملا۔جب ریٹائرمنٹ کا وقت قریب آیا،ان کے سامنے ایک پرکشش پیش کش موجود تھی۔ ایک اہم سرکاری ادارہ میں انہیں ڈائریکٹر بنایا جا رہا تھا۔انہوں نے اس عہدے کو اپنی خوش قسمتی تصوّر کیا لیکن فیصلہ کرنے سے پہلے ایبٹ آباد کے ایک ملنگ سے مشورہ کرلیا۔ ملنگ نے اپنی ترنگ میں کہہ دیا اِدھر جانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ چنانچہ بریگیڈیئر اعجاز اکبر نے اتنی بڑی پیش کش رد کردی۔ پھر انہوں نے آرمی برن ہال سکول سے اپنی ریٹائرمنٹ سے ایک سال پہلے اپنا تعلیمی ادارہ بنوالیا۔ پاکستان انٹرنیشنل پبلک سکول ایبٹ آباد کرائے کی عمارت میں قائم کیا گیا۔ اُس برس آرمی برن ہال سکول سے مسترد کردہ کئی بچوں کو نئے سکول میں داخلہ مل گیا۔یوں ناکام بچوں کے مایوس والدین کے لئے اعجاز اکبر اور اعجاز اکبر کے لئے مایوس والدین سہارا بن گئے۔ بریگیڈیئر اعجاز اکبر کی زندگی کا یہ نیا دور صبر آزما دور تھا۔دن رات محنت کر کے انہوں نے اپنے تعلیمی ادارہ کو مستحکم کیا۔اس کی ساکھ بنائی۔اب یہ عالم ہے کہ ادارہ کی اپنی عالی شان عمارت ہے اور ایک بڑے تعلیمی کمپلیکس کی تعمیر کا منصوبہ تکمیل کی طرف گامزن ہے۔ اسکول وکالج کا سالانہ بجٹ دو کروڑ روپے سے زیادہ ہوتا ہے۔

بریگیڈیئر صاحب بے حد خوش مزاج اور زندہ دل انسان ہیں۔طبیعت روانی پر آئی ہوئی ہو تو پھر وہ کہیں اور سنا کرے کوئی۔لیکن افسوس اس خوش مزاج محمد اعجاز اکبر کو ’’فوجی آدمی‘‘ اور کاروباری مصروفیات دبا دیتی ہیں۔ان کے پاس فی الوقت اتنی دولت اور اتنے وسائل ہیں کہ ان کو بے دردی سے نہ لٹایا جائے تو ان کی آنے والی سات پُشتیں آسائش کی زندگی بسر کرسکتی ہیں۔ پھر پتہ نہیں کیوں یہ اب آرام نہیں کرتے۔انسان دولت اپنے سکھ اور آرام کے لئے کماتا ہے لیکن اگر آرام نہیں کرنا تو پھر اس دولت کا کیا فائدہ۔۔کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ جس لڑکے نے انتہائی غربت اور افلاس کے سائے میں ابتدائی زندگی گزاری تھی،حالات کی بے یقینی سے نکل آنے کے باوجود حالات کی بے یقینی اور خدشات کا شکار ہے۔اسی لڑکے نے شاید بریگیڈیئر محمد اعجاز اکبر کو

ابھی تک کاروباری مصروفیات میں الجھا رکھا ہے۔

پاکستان انٹرنیشنل پبلک سکول اینڈ کالج ایبٹ آباد بلاشبہ ایک معیاری درسگاہ ہے جس کا مقابلہ ''آرمی برن ہال'' اور ''اے پی ایس'' جیسی اعلیٰ درسگاہوں سے ہے۔عموماً ایسا ہوتا ہے کہ جن طلبہ کو مذکورہ دونوں درسگاہوں میں داخلہ نہیں مل پاتا انہیں PIPS میں داخلہ مل جاتا ہے۔اس کے باوجود امتحانی نتائج میں مقابلہ ہمیشہ سخت رہتا ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ بریگیڈیئر صاحب اساتذہ کا انتخاب کرتے وقت ان کے علمی معیار اور پیشہ ورانہ صلاحیت کو مدّنظر رکھتے ہیں اور بندے کو پرکھنے میں بہت کم دھوکہ کھاتے ہیں۔PIPS کے نسبتاً کمزور ٹیچروں کو برن ہال اور اے پی ایس میں ملازمت مل جاتی ہے۔ایک بار تینوں تعلیمی اداروں کے چند اساتذہ جمع تھے۔گپ شپ کے دوران برن ہال کے ایک ٹیچر نے مذاق کرتے ہوئے کہا: جس لڑکے کو ہم نکما سمجھ کر داخلہ نہیں دیتے اسے PIPS میں داخلہ مل جاتا ہے۔اس پر PIPS کے ایک ٹیچر نے اسی انداز میں جواب دیا آپ کی بات درست ہے لیکن اس میں یہ اضافہ کرلیں کہ جس ٹیچر کو PIPS والے ناکارہ سمجھ کر نکال دیتے ہیں آپ انہیں ٹیچر رکھ لیتے ہیں۔یہ باتیں خوشگوار موڈ میں ہوئی تھیں لیکن اس میں شک نہیں کہ دونوں اداروں کے ٹیچرز کی دونوں باتیں عمومی طور پر درست ہیں۔

بریگیڈیئر صاحب کو ان کی ایک خوبی یا کمزوری کے باعث بآسانی دھوکہ دیا جاسکتا ہے۔کسی کی دکھ بھری داستان سن کر آبدیدہ ہوجاتے ہیں۔ایک صاحب نے اس طرح انہیں اپنی دکھ بھری داستان سنائی کہ انٹرویو لینے والا اور دینے والا دونوں زاروقطار رورہے تھے۔پھر ان صاحب کو گریڈ اٹھارہ میں ملازمت مل گئی لیکن تین ماہ کے اندر ان کی داستان کا جھوٹ اور بحیثیت ٹیچر اصلیت ظاہر ہوگئی چنانچہ انہیں باعزت اور قانونی طریقے سے فارغ کردیا گیا۔۔ایک اور صاحب جو طالب علم بننے کے لائق بھی نہیں تھے، ٹیچر بن گئے۔پھر انہوں نے سیاست بازی بھی شروع کردی چنانچہ انہیں بھی قانونی طریقے سے فارغ کردیا گیا۔موصوف سیاسی اثر رسوخ رکھتے تھے اس لئے ایسی اونچی سفارش لے آئے کہ بریگیڈیئر صاحب کے لئے انکار کی گنجائش ہی نہیں تھی۔لیکن وہ ادارے کے طلبہ کو خراب نہیں کرنا چاہتے تھے۔چنانچہ انہوں نے

سفارش کرنے والی ہستی سے مودبانہ طور پر گذارش کی کہ میں ان صاحب کو کلاسز تو نہیں دے سکتا البتہ انہیں گھر بیٹھے پوری تنخواہ ماہ بماہ بھجوادیا کروں گا۔اس گذارش کے نتیجہ میں ان کی باآسانی گلوخلاصی ہوگئی۔۔ان واقعات سے یہ بھی نہ سمجھیں کہ بریگیڈیئر صاحب کسی کارخانہ دار کی طرح اپنے ٹیچروں کی چھٹی کراتے رہتے ہیں۔اول تو ایسی مثالیں دوچار ہیں پھر ان کا طریقہ کار یہ ہے کہ اگر کوئی ٹیچر بڑی کلاسز کو ٹھیک طرح سے پڑھا نہیں سکتا تو پہلے اسے طریقے سے سمجھاتے ہیں۔طرزِ عمل میں تبدیلی نہ آئے تو اسے چھوٹی کلاسیں دے دی جاتی ہیں۔وہ کلاسیں بھی نہ سنبھالی جائیں تو پھر اس سے بھی چھوٹی کلاسیں دے دی جاتی ہیں۔مقصد یہی ہوتا ہے کہ ممکنہ حد تک کوشش کی جائے کہ کوئی شخص بے روزگار نہ ہونے پائے۔۔ایک ٹیچر ایم۔اے اسلامیات تھے۔اسلامیات پڑھاتے تھے۔ہوم ورک چیک کئے بغیر دستخط کردیتے تھے۔امتحانی پرچے جانچے بغیر نمبر دے دیتے تھے۔جونیئر کیمبرج کے ایک طالب علم نے اسلامیات کے پرچہ میں حدیث شریف افضل الذکر لا الہ الا اللہ کا ترجمہ یوں کیا

AFZAL SAID THAT LA ILAHA ILLALLAH:

یہ جواب درست سمجھا گیا اور پورے نمبر دیئے گئے تب اس ٹیچر کو بلا کر بریگیڈیئر صاحب نے سمجھایا کہ رزق حلال کرکے کھانا چاہئے۔آنکھیں بند کرکے نمبر دے دینے سے تعلیمی معیار بہتر نہیں ہوجائے گا۔حالانکہ ایسے ٹیچر کو کھڑے کھڑے فارغ کیا جاسکتا تھا۔لیکن انہوں نے اصلاح کا موقعہ ضرور دیا۔

جب میں نے اکتوبر ۱۹۹۰ء میں PIPS کو جائن کیا، میرا قیام ٹیچرز کے بیچلر ہاسٹل میں تھا۔فیملی ہاؤس تو مارچ میں جا کر ملنا تھا لیکن دسمبر کے وسط میں مبارکہ اور بچوں کو بھی میں نے بلالیا۔ایک اور دوست کا کمرہ لے لینے سے ہمارا الگ پورشن بن گیا تھا۔اس عمارت میں پانچ اور اساتذہ بھی مقیم تھے۔فزکس کے ایک استاد دن رات ہیٹر چلاتے تھے۔جب دسمبر کے مہینے کا بجلی کا بل آیا تو غیر معمولی حد تک زیادہ تھا۔مجھے پتہ بھی نہیں تھا اور فزکس کے انہی استاد صاحب نے استادی دکھائی۔بریگیڈیئر صاحب سے جا کر کہہ دیا حیدر قریشی اپنی فیملی کو لے آیا ہے اور اسی نے

ہی بجلی کا اتنا استعمال کیا ہے۔ اس سلسلہ میں انہوں نے کسی طرح کیئر ٹیکر کو بھی ساتھ ملا لیا۔ اگلے روز بریگیڈ یئر صاحب نے برہمی کے ساتھ مجھے کہا کہ بجلی کے استعمال میں کچھ تو احتیاط کریں۔ میں چکرا گیا۔ اس وقت تو کچھ نہ کہا۔ گھر آ کر تفصیلی خط لکھ کر انہیں بھجوا دیا۔ اس سے اگلے روز میں بازار کی طرف جا رہا تھا، ایک کار میرے قریب آ کر رکی، دیکھا تو بریگیڈ ئیر صاحب تھے۔ گاڑی میں بٹھا لیا اور کہنے لگے: رات گئی بات گئی۔ آپ تو خوامخواہ جذباتی ہو گئے۔ میرے لئے اتنی دلجوئی کافی تھی۔ فزکس کے مذکورہ استاد چونکہ بجلی کے بے محابا استعمال کے عادی تھے اس لئے اگلے سال دسمبر میں دسمبر ۱۹۹۰ء سے بھی ہزار ڈیڑھ ہزار روپے زیادہ کا بل آ گیا۔ اتفاق سے اب اس عمارت میں صرف تین اساتذہ ہی مقیم تھے چنانچہ بریگیڈ ئیر صاحب نے سٹاف میٹنگ کے دوران بڑے اچھے طریقے سے انہیں بجلی کے بل کی زیادتی سے آگاہ کیا اور وہ صاحب سب کے سامنے زمین میں گڑے جا رہے تھے۔

بریگیڈ ئیر صاحب اچھے ادبی ذوق کے مالک ہیں۔ مجھے انہوں نے کئی بار محبت کے ساتھ اور ایک بار ڈانٹ کر داد دی۔ میں کبھی اپنی کوئی تازہ غزل، افسانہ یا خاکہ انہیں برائے مطالعہ دیتا تو اس کی تعریف کے ساتھ تجزیاتی نوٹ بھی ساتھ ہی لکھا آتا۔ ایک بار ایک غزل کے ساتھ ان کی ''جواب آں غزل'' موصول ہوئی تو پتہ چلا کہ انہیں شعر کے وزن کا بھی علم ہے۔ افسانہ ''کاکروچ'' پڑھنے کے بعد ایک دفعہ بعض اساتذہ سے کہنے لگے: میں حیران ہوں یہ اردو کے ٹیچر ہیں یا سائنس کے۔ ایک بار میری کلاس میں آئے اور کالج کے طلبہ سے کہنے لگے: آپ لوگوں کی خوش قسمتی ہے کہ ایسا...ادیب آپ کا استاد ہے...ان سے علم حاصل کرنے کے لئے انہیں نچوڑ لیں۔ پھر مسکرا کر بولے لیکن بلی کی طرح نہلا کر نہیں نچوڑیں۔ PIPS کی وائس پرنسپل مس روزلین کی والدہ کا انتقال ہو گیا تھا۔ ان سے ان کی والدہ کی باتیں ہو رہی تھیں۔ دوران گفتگو میں نے انہیں اپنی والدہ کا خاکہ ''مائی نی میں کنوں آکھاں'' کے بارے میں بتایا۔ انہوں نے وہ خاکہ پڑھنے کا اشتیاق ظاہر کیا۔ میں نے ''اوراق'' کا وہ شمارہ انہیں بھیج دیا جس میں وہ خاکہ چھپا تھا۔ اگلے دن بریگیڈ ئیر صاحب ملے تو برہمی سے کہنے لگے: یہ آپ نے کیا زیادتی بلکہ حماقت

کردی ہے؟۔۔ میں پریشان، یاالٰہی یہ ماجرا کیا ہے۔ پھر کہنے لگے مس روزلین کو اپنی والدہ والا خاکہ کیوں دیا تھا۔ والدہ کی وفات کے بعد دو ماہ میں بمشکل ان کی طبیعت سنبھلی تھی لیکن آپ کا دیا ہوا خاکہ پڑھ کر انہوں نے رو رو کر برا حال کر لیا ہے۔ میرے لئے انہیں چپ کرانا مسئلہ بن گیا ہے۔ پھر تھوڑا سا رُکے اور کہنے لگے ان کی والدہ تو ابھی فوت ہوئی ہیں، میری ماں کو فوت ہوئے مدت گذر چکی ہے لیکن خاکہ پڑھ کر تو میرے بھی آنسو نکل آئے تھے۔ یہ کہتے کہتے ان کی آواز بھرا گئی اور وہ تیزی سے اپنے آفس میں چلے گئے۔ ان کی ڈانٹ والی اس داد کو میں آج بھی اپنے سینے سے لگائے ہوئے ہوں۔

بریگیڈ ئیر صاحب اسلام سے گہری وابستگی رکھتے ہیں۔ چونکہ صوفیائے کرام سے محبت اور عقیدت رکھتے ہیں اسی وجہ سے وسیع المشرب اور کشادہ نظر ہیں۔ شروع میں ایک ملنگ کا ذکر آیا ہے جس نے بریگیڈ ئیر صاحب کو ڈائریکٹر کی پیش کش قبول کرنے سے روکا تھا۔ بعد میں اس ملنگ کا روکنا بے حد مفید ثابت ہوا۔ چنانچہ صوفیاء، فقیروں اور ملنگوں سے ان کی عقیدت اور بھی بڑھ گئی۔ ایبٹ آباد کے مذکورہ ملنگ ایک ننگ دھڑنگ مجذوب ہیں۔ بریگیڈ ئیر صاحب انہیں جہاں کہیں بھی دیکھ لیں اپنی کار میں بیٹھنے کی درخواست کر دیتے ہیں۔ اکثر یوں ہوا کہ ملنگ بابا عالمِ جذب سے حکم صادر کرتے راولپنڈی چلو۔ گاڑی حسن ابدال تک پہنچتی تو صدا آتی اب مانسہرہ چلو۔ چنانچہ وہیں سے پھر واپس ہو کر مانسہرہ کا سفر شروع ہو جاتا۔ ایک بار تو رات کے دو بج گئے۔ اہل خانہ پریشان کہ بریگیڈ ئیر صاحب بتائے بغیر کہاں چلے گئے۔ بعد میں پتہ چلا ملنگ بابا کے حکم کی تعمیل ہو رہی تھی۔ میں نے بھی ایک بار ان ملنگ بابا کو ننگ دھڑنگ حالت میں بریگیڈ ئیر صاحب کے ساتھ ان کی کار کی اگلی سیٹ پر تشریف فرما دیکھا ہے۔ ان کے بیٹھنے کے انداز سے مجھے ایک ہلکی سی تشویش ضرور ہوئی کہ دوران سفر گیئر تبدیل کرتے ہوئے بریگیڈ ئیر صاحب کا ہاتھ کہیں چوک نہ جائے۔ مسائل تصوف سے مجھے بھی تھوڑی بہت رغبت ہے، تاہم میں انسانی لاشعور میں ہزاروں برس پرانے کلچر کی کارفرمائی کو بھی تلاش کرتا رہتا ہوں۔ بریگیڈ ئیر صاحب کے ملنگ بابا کو دیکھ کر کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ لنگ پوجا کے قدیم تصور نے صورت بدل کر کیسا شاندار روپ

اختیار کرلیا ہے۔

میرے اور بریگیڈ ئیر صاحب کے مزاج اور عادات میں بہت سی باتیں مشترک ہیں۔لیکن یہ ہم آہنگی میرے لئے سودمند ہونے سے زیادہ خطرناک تھی کیونکہ دوشیر ایک کچھار میں نہیں رہ سکتے۔حسن کے معاملے میں ہم دونوں کا ذوق بالکل ایک جیسا تھا۔جیسے چہرے مجھے اچھے لگتے ہیں ویسے ہی انہیں اچھے لگتے ہیں ایک دوجھٹکوں کے بعد جب مجھے اس ''حُسنِ توارد'' کا احساس ہوا تو میں نے خود ہی محتاط رویہ اختیار کرلیا کہ آخر مجھے نوکری بھی کرنا تھی۔

بریگیڈ ئیر صاحب کی درسگاہ میں ملازمت کا مجھے ایک فائدہ یہ ہوا کہ طاہر احمد، میجر اظہر علی، محمد منیر، سید مختار شاہ، سید طیب علی، ارشد عادل اور مرتضٰی جمال جیسے خوبصورت اور پیارے اساتذہ سے میرا دوستی اور محبت کا تعلق قائم ہوا۔ نیز مولوی محمد یونس، میجر شاہجہاں اور مسٹر ایڈون جیسے ''صاحبانِ علم'' لوگوں کو دیکھنے کی سعادت بھی نصیب ہوئی۔

پاکستان انٹرنیشنل پبلک سکول اینڈ کالج ایبٹ آباد ایک مستحکم تعلیمی ادارہ بن چکا ہے۔اس کی شاخیں گجرات اور گوجرانولہ میں بھی قائم کردی گئی ہیں۔بعض عرب ممالک میں پاکستانیوں کے بچوں کو جو تعلیمی مسائل درپیش ہیں ان کے پیش نظر بریگیڈ یئر صاحب کسی عرب ملک میں بھی PIPS کا سکول شروع کرنے کے آرزومند تھے۔میں ان کی کامیابیوں کے لئے دعا گو ہوں لیکن میری دلی خواہش ہے کہ وہ اپنی دفتری مصروفیات کو آدھا کم کردیں۔ان کی بیٹی رخسانہ اور دونوں بیٹے ان کے حصّے کی ساری ذمہ داریاں سنبھالنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ویسے مجھے علم ہے کہ میری یہ خواہش کبھی پوری نہیں ہونے والی، ان کے اندر کا فوجی اور لڑکپن کا غریب اور محنتی اعجاز، دونوں مل کر انہیں کبھی آرام سے بیٹھنے نہیں دیں گے۔

☆☆☆

میرا فیثا غورث

(طاہر احمد)

خوشی کے لمحے لکھو، عمرِ اضطراب لکھو
نکالو وقت کبھی عشق کا حساب لکھو

ایبٹ آباد میں ہم دونوں ایک ہی تعلیمی ادارے میں پڑھاتے تھے۔طاہر کا مضمون ریاضی تھا۔لائبریری میں ایک بار اسے چند ادبی کتابیں اشو کراتے اور جمع کراتے دیکھا تو تھوڑی سی حیرت ہوئی۔استفسار کیا تو پتہ چلا اچھا ادب پڑھنے کا شوق ہے۔گفتگو کی تو معلوم ہوا آپ کرشن چندر سے لے کر بانو قدسیہ تک اور فیض سے لے کر وزیر آغا تک ادیبوں پر بھی بات کرسکتے ہیں اور ان کے ادب پر بھی۔اس وقت تو مجھے شدید حیرت ہوئی جب اس جوان نے بتایا کہ وزیر آغا کی غزلوں اور نظموں میں سیاسی اثرات بہت نمایاں ہیں اور ثبوت کے طور پر شعری حوالے بھی دے دیئے۔دوستی کچھ اور بڑھی تو پتہ چلا طاہر کو کلاسیکی، نیم کلاسیکی اور لوک موسیقی سے گہرا شغف ہے۔فوٹوگرافی کا شوق ہے، پاک محبت کرنے کا جذبہ ہے۔ان چیزوں کا کچھ کچھ شوق مجھے بھی ہے اس لئے اس طرح ہماری دوستی مزید بڑھی۔ایبٹ آباد کی خوبصورت وادی نے ہم دونوں کو دیوانہ بنا رکھا تھا۔ہم روزانہ لمبی سیر کے لئے نکلتے۔آبادی سے باہر نکل کر مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی۔گفتگو سے تھک جاتے تو شوقیہ گلوکاری شروع کردیتے۔ ہماری دوستی اتنی گہری ہوتی گئی کہ اچھا ذہن رکھنے والوں نے کہنا شروع کردیا: خدا دوستوں کی یہ جوڑی

سلامت رکھے اور کم ظرفوں کے لئے یہ دوستی حسد کا موجب بن گئی۔ موسیقی، فوٹوگرافی اور ''پاک محبت'' کے مشترکہ شوق ایک طرف تھے تو دوسری طرف الٰہیات، ادبیات اور سیاسیات کے موضوعات ہمیں مزید قریب لاتے گئے۔ دوستی کی وجہ یہ نہیں تھی کہ ہم میں مکمل اتفاق رائے پایا جاتا تھا۔ مکمل اتفاق رائے ہوتا تو میں یقیناً یہ سمجھ لیتا کہ میرا موقف ہی غلط ہے۔ ہم میں ڈھیروں ڈھیر اختلاف رائے تھا لیکن اس اختلاف رائے میں ایک دوسرے کے موقف کو سمجھنے اور سمجھانے کا انداز ہوتا تھا۔

میں تصوف کے مضمون سے دلچسپی رکھتا ہوں۔ طاہر کے نزدیک تصوف کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جو مایوسی کا زائیدہ ہے، دوسرا وہ جو اپنے دور کی آمریتوں کے خلاف کلمۂ حق بن کر ابھرا اور جس نے مذہبی رواداری کو فروغ دیا۔ ادب میں طاہر ترقی پسند مسلک کا حامی ہے۔ فیض کی شاعری کا دیوانہ لیکن وزیر آغا کی جدید شاعری بھی اسے پسند ہے اور اس میں سے ترقی پسند تصورات اس طرح نکال کر دکھاتا ہے جیسے رومال میں سے کبوتر نکال کر دکھائے جاتے ہیں۔ احمد ندیم قاسمی کے لئے اس کے دل میں ایک نرم گوشہ تھا لیکن جس دن جنگ میگزین میں قاسمی صاحب کا وہ ''معرکۃ الآراء'' انٹر یو شائع ہوا۔ جس میں انہوں نے دھمکیاں دیتے ہوئے کہا تھا میرے مداح اتنے زیادہ ہیں کہ اگر میں انہیں اشارہ کر دوں تو وہ میرے مخالفین کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیں۔ طاہر بجھے ہوئے دل کے ساتھ میرے پاس آیا اور کہنے لگا میں اب تک قاسمی صاحب کے حق میں جو کچھ کہتا رہا ہوں اس پر شرمندہ ہوں۔ اس معاملے میں مجھے آپ کا موقف اب کافی درست لگنے لگا ہے۔

طاہر نے بی ایس سی کرنے کے بعد کچھ عرصہ ایک میڈیکل کمپنی کے نمائندہ کی حیثیت سے کام کیا۔ اچھی خاصی آمدنی تھی لیکن پھر اس پر ایم ایس سی کرنے کی دھن سوار ہوگئی۔ چنانچہ اس نے ریاضی میں ایم ایس سی کر لیا۔ میرے ایبٹ آباد آنے سے تھوڑا عرصہ پہلے طاہر نے PIPS کو جائن کر لیا تھا اور جب میں نے ایبٹ آباد کو چھوڑا تو اس کے معاً بعد طاہر نے بھی ایبٹ آباد کو چھوڑ کر لارنس کالج گھوڑا گلی مری میں ملازمت کر لی۔ طاہر کی بہت سی اچھی عادتوں سے میں بہت تنگ آیا ہوا تھا۔ مثلاً کہیں جانا ہے تو طاہر کہتا بس میں پانچ منٹ میں تیار ہو جاتا ہوں اور پھر یہ پانچ

منٹ آدھے گھنٹے سے پہلے مکمل نہیں ہوتے تھے۔ لباس کے رکھ رکھاؤ کے سلسلے میں جتنا میں غیر ذمہ دار ہوں، طاہر اتنا ہی نفاست پسند ہے۔ خط لکھنے کے معاملے میں طاہر انتہا درجے کا سست واقع ہوا ہے۔ پہلے تو خط ہی نہیں لکھ پاتا۔ اگر غلطی سے کبھی کوئی خط لکھ لیا تو کم از کم ایک ہفتہ کے بعد جا کر اسے پوسٹ کر پاتا۔ خدا کا شکر ہے کہ میرے ملک چھوڑنے کے نتیجہ میں طاہر کی کاہلی کسی حد تک ختم ہو رہی ہے۔ میرے خطوط کے بروقت جواب دے کر طاہر نے مجھے حیران کر دیا ہے۔ اللہ کرے میری یہ حیرت قائم رہے۔

ہمارے تعلیمی ادارے پاکستان انٹرنیشنل پبلک سکول اینڈ کالج ایبٹ آباد کی نئی عمارت کے سنگ بنیاد کی تقریب تھی۔ بریگیڈئیر صاحب نے اپنے مرشد کو مدعو کیا ہوا تھا۔ انہوں نے مختصر سا خطاب فرمایا اور بتایا کہ وہ چودہ سال یورپ میں گذار کر آئے ہیں۔ وہاں کی زندگی ایک سراب ہے۔ بعد میں طاہر کہنے لگا مجھے دس سال یورپ میں گزارنے کا موقعہ مل جائے تو میں بعد میں پیر صاحب سے بھی زیادہ شدت کے ساتھ مغربی زندگی کی مذمت کروں گا لیکن پہلے اسے چکھنے کا موقعہ تو ملے۔ اس تقریب میں نماز عصر بھی ادا کی گئی۔ بعد میں میجر اظہر کہنے لگے۔ ہم نے تو محض بریگیڈئیر صاحب کی وجہ سے یہاں نماز پڑھی ہے۔ کیا مجبوراً پڑھی گئی نماز کا ثواب ملے گا؟ میں نے کہا جو نماز آپ اپنی مرضی سے پڑھتے ہیں کیا اس کا ثواب ملے گا؟۔۔ میری بات پر میجر اظہر اور طاہر نے بھر پور قہقہے لگائے۔ طاہر نے تو اتنی داد دی کہ مجھے وضاحت کرنا پڑی کہ حضرت رابعہ بصریؒ، دعا فرمایا کرتی تھیں: اے خدا اگر میں اس لالچ کی وجہ سے تیری عبادت کرتی ہوں کہ تو مجھے جنت میں داخل کرے تو مجھے ہرگز جنت میں داخل نہ کرنا۔ اور اگر میں اس خوف سے تیری عبادت کرتی ہوں کہ کہیں تو مجھے جہنم میں نہ ڈال دے تو مجھے ضرور جہنم میں ڈالنا۔ لیکن اگر میں تیری عبادت تیری محبت میں کرتی ہوں تو پھر تو مجھ سے جو چاہے سلوک کر۔ میں خوش ہوں۔۔ یہ بات بتا کر میں نے کہا کہ عبادت تو ثواب اور عذاب کی مقصدیت سے بالاتر ہوتی ہے۔ سچی عبادت اپنا اجر آپ ہوتی ہے۔ میری بات سن کر طاہر کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی اور کہنے لگا اب آپ بالواسطہ طور پر اپنا ادبی موقف بیان کرنے لگے ہیں۔ میں نے کہا جی ہاں سچا ادب بھی سچی عبادت

کی طرح اپنا اجر آپ ہوتا ہے۔

کالج کی ایک اور دعائیہ تقریب میں بھی مذکورہ پیر صاحب آئے ہوئے تھے۔ درود شریف کی فضیلت پر انہوں نے بڑا عمدہ لیکچر دیا۔ دوران تقریر انہوں نے فرمایا کہ مسلمان کو درود شریف پڑھنے کا اجر دنیا میں ملے نہ ملے آخرت میں ضرور ملتا ہے لیکن اگر کوئی کافر بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیجے تو اسے آخرت میں تو نہیں لیکن اسی دنیا میں ہی اس کا اجر مل جاتا ہے۔ تقریب کے بعد جب لڈو تقسیم ہونے لگے تو طاہر آہستہ سے مجھے کہنے لگا زیادہ سے زیادہ لڈو لے لیں چونکہ ہمیں درود شریف پڑھنے کا جو اجر ملنا ہے اسی دنیا میں ملنا ہے۔ طاہر کا جملہ سنتے ہی فارسی کا ایک شعر یاد آ گیا:

کافرِ عشقم مسلمانی مرا درکار نیست
ہر رگِ من تار گشتہ حاجتِ زنّار نیست

امام غزالی کی طرح طاہر نے بھی کوچۂ الحاد کی سیر کی ہے۔ مذہب کے نام لیواؤں کی نفرت انگیز اور انسانیت سوز حرکات نے اسے مذہب سے بدظن کر دیا تھا۔ پھر پرویز صاحب کا مطالعہ کرنے سے اسے دوبارہ دین سے رغبت ہوئی۔ خود سیدھا سادہ مسلمان ہے لیکن پرویز صاحب کی دینی خدمات کا مداح ہے۔ عالمی سطح پر مسلمانوں کی حالت زار پر میں نے اسے کڑھتے دیکھا ہے۔ ایک بار کہنے لگا مسلمانوں کے تنزل کا سبب ان کی فرقہ پرستی اور خوش عقیدگی ہے۔ ہلاکو خاں کے بغداد پر حملہ کے وقت بڑے بڑے علماء ان ایمان افروز موضوعات پر مناظرہ بازی میں مشغول تھے کہ سوئی کے ناکے میں سے ستر ہزار فرشتے بیک وقت گزر سکتے ہیں یا نہیں؟ اور حضرت آدم کی ناف تھی یا نہیں تھی؟ ۔ ایک طرف یہ مناظرہ بازی تھی، دوسری طرف یہ خوش عقیدگی کہ خلیفہ کو خدا نے بنایا ہے کوئی اسے ہاتھ بھی نہیں لگا سکتا۔ چنانچہ جب ہلاکو خاں نے پورے بغداد کی اینٹ سے اینٹ بجا دی تب خلیفہ کو ہاتھ لگانے کی جرأت نہیں کی۔ بس ایک قالین میں اسے رول کر کے، اس پر گھوڑے دوڑا دوڑا کر اسے ہلاک کرایا۔ طاہر کا خیال ہے کہ جب تک مسلمان متحد ہو کر سچے دل سے قرآن پر عمل پیرا نہیں ہوتے ان کے اچھے دن نہیں آ سکتے۔ قرآن پر عمل

کرنے کے لئے ان تمام روایات کو چھوڑنا ہوگا جن کی وجہ سے مسلمان گروہ در گروہ ہوتے چلے گئے اور ہوتے چلے جا رہے ہیں۔

طاہر نے سبطِ حسن کی کتابیں پڑھ رکھی تھیں۔ میں نے اسے ''مزید گمراہ'' کرنے کے لئے سید علی عباس جلالپوری کی کتابیں پڑھنے کی راہ پر لگا دیا۔ سید صاحب کو پڑھتے پڑھتے اسے فلاسفروں کو پڑھنے کا شوق چرایا۔ طاہر نے اپنے شوق سے مجھے آگاہ کرتے ہوئے یہ شکایت کی کہ یونانی فلاسفر خاصے مشکل ہیں۔ ان کی باتیں سمجھ میں نہیں آتیں۔ میں نے علیگڑھ کے مشہور اسٹائل میں کہا:

کہا ہم فلسفہ پڑھ لیں   کہا تم فلسفہ پڑھ لو
کہا یونان کا ڈر ہے   کہا یونان تو ہوگا

طاہر دیر تک اس ''تک بندی'' کا لطف لیتا رہا پھر کہنے لگا یونان تو ہمارے ہر شعبۂ علم پر چھایا ہوا ہے۔ اس سے نجات ممکن نہیں۔

اپنے بھائی سے اسے محبت ہے۔ بہنوں سے بے حد محبت ہے۔ بھانجیوں سے دوستی ہے۔ بھتیجے سے یاری ہے (اور اب تو شادی شدہ بھی ہو گیا ہے) لیکن والد اور والدہ کے معاملے میں بے حد جذباتی ہے۔ ایک بار اطلاع ملی کہ والدہ کو سر پر چوٹ لگی ہے۔ طاہر فوراً سرگودھا جانے کے لئے تیار ہو گیا۔ میں نے اسے سمجھایا کہ پہلے فون پر معلوم کر لو پھر جیسے جی چاہے کرنا۔ طاہر نے فون کیا تو دوسری طرف سے والدہ نے ہی فون اٹھایا اور طاہر کو اپنی خیریت بتائی، تسلی دی۔ اس وقت مجھے ایسے لگا جیسے کوئی چھوٹا سا بچہ ماں کے سینے سے چمٹا ہوا اس کا سارا درد اپنے سینے میں اتار رہا ہو۔ طاہر کی حالت ایسی جذباتی ہو رہی تھی کہ فون پر بات ہو جانے کے بعد ہم دونوں دیر تک خاموش رہے۔

اُس جذباتی حالت کے حوالے سے تو ہم آج تک خاموش ہیں۔

☆☆☆

پرانے ادبی دوست

(خان پور کے احباب)

شہر کی گلیوں نے چومے تھے قدم رو رو کر
جب ترے شہر سے، یہ شہر بدر آئے تھے

چھوٹی موٹی تک بندی تو دو تین سال پہلے سے جاری تھی لیکن میں نے باقاعدہ طور پر شاعری کا آغاز ۱۹۷۱ء میں کیا۔ اس شوق کو چھپا چھپا کر رکھا۔ کسی ہفت روزہ کو غزل بھیج دی۔ چھپ گئی تو کئی دن تک خوشی کے نشے میں رہا، مگر کسی محفل میں کلام سنانے کا مجھے کوئی تجربہ نہ تھا۔ جمیل محسن اسکول کے زمانے کا میرا دوست تھا۔ ۱۹۷۳ء کا کوئی دن تھا۔ جمیل محسن میرے پاس آیا اور کہنے لگا کہ ہم نے ایک ادبی انجمن ''بزمِ فرید'' قائم کی ہے۔ آج شام کو اس کے زیرِ اہتمام ایک شعری نشست ہو رہی ہے آپ بھی اس میں شرکت کریں۔ میں نے جمیل سے صاف صاف کہہ دیا کہ مجھے مشاعرے پڑھنے کا کوئی تجربہ نہیں ہے۔ اگر اپنے ساتھ لے جاؤ گے تو جانے کی ہمت کرلوں گا چنانچہ وقت مقررہ پر جمیل مجھے لینے آ گیا۔ خانپور کے جیٹھ بھٹہ بازار میں ایک بڑی سی دوکان کے اندر فرشی نشست تھی۔ بیس کے لگ بھگ حاضرین موجود تھے۔ بڑے احترام کے ساتھ میرا استقبال کیا گیا۔ مشاعرہ شروع ہوا۔ جب مجھے کلام سنانے کی دعوت دی گئی مجھ پر شدید گھبراہٹ طاری تھی۔ پتہ نہیں میں نے غزل کیسے پڑھنی شروع کی اور

کیسے مکمل کی اتنا یاد ہے کہ غزل ختم ہونے پر دوکان داد سے گونج رہی تھی اور میں پسینے سے تر بتر تھا۔ یہ بزمِ فرید میں میری پہلی آمد تھی۔ یہ بزم ریاست بہاولپور کی عظیم رحانی شخصیت اور سرائیکی شاعری کی عظیم ہستی حضرت خواجہ غلام فرید رحمۃ اللہ علیہ کے نامِ نامی اسمِ گرامی سے منسوب تھی۔

اگلے ہفتے بزم کا انتظامی اجلاس تھا۔ اس میں مجھے جائنٹ سکریٹری کا عہدہ دیا گیا جسے میں نے اپنے لئے اعزاز سمجھتے ہوئے قبول کرلیا۔ جنرل سکریٹری جمیل محسن تھا اور بزم کے صدر ملک غلام رسول سندر تھے۔ مزید اگلے دو ہفتوں تک جمیل محسن نے جنرل سکریٹری کا عہدہ مجھے سونپ دیا اور خود مجلس عاملہ کی رکنیت پر قناعت کرلی۔ بحیثیت جنرل سکریٹری میں نے بزمِ فرید کی پریس رپورٹنگ پر خاص توجہ دی۔ اس سلسلہ میں بہاولپور کے ہفت روزہ ''مدینہ'' کے ایڈیٹر علامہ منظور احمد رحمت کی خصوصی توجہ، محبت اور حوصلہ افزائی کا اعتراف نہ کروں تو احسان فراموشی ہوگی۔ یہ وہ دور تھا جب میں ابھی قلم پکڑنا سیکھ رہا تھا۔ علامہ منظور احمد رحمت نے ہفت روزہ ''مدینہ'' میں نہ صرف بزمِ فرید کی ادبی رپورٹیں شائع کیں بلکہ مجھے مختلف ادبی اور سماجی موضوعات پر لکھنے کی تحریک کر کے نثر نگاری کی طرف راغب کیا۔ میری ابتدائی دور کی ڈھیروں ڈھیر غزلیں ''مدینہ'' میں چھپتی رہیں۔ اگرچہ اب وہ غزلیں میرے کسی مجموعے میں شامل نہیں ہیں لیکن آج میں جتنا بھی چھوٹا موٹا ادیب ہوں اس میں ہفت روزہ مدینہ بہاولپور کی حوصلہ افزائی اور علامہ منظور احمد رحمت کی محبت کا بہت حصہ ہے۔۔ بزمِ فرید خانپور کے بیشتر شعراء واجبی سی تعلیم کے حامل تھے۔ ملک غلام رسول سندر، امیر بخش حاذق، بابا علی بخش سیف فریدی، عبدالرحیم خوشدل، عبدالرشید گابلہ۔۔ یہ لوگ سرائیکی کے شاعر تھے۔ رئیس گل دل سرائیکی اور اردو دونوں میں شاعری کرتا تھا جمیل محسن اور رشید ایاز صرف اردو غزلیں سناتے تھے۔

مذکورہ بالا دوستوں نے سماجی لحاظ سے معزز شاعروں کی ادبی انجمن کو چھوڑ کر اپنی الگ بزم سجائی تھی۔ حاذق، بابا سیف اور گابلہ تینوں مکانات کی تعمیر کا کام کرتے تھے۔ خوشدل کی اپنے تیار کردہ جوتوں کی دکان تھی۔ رئیس گل دل ریڈیو مکینک کا کام کرتا تھا۔ جمیل غالباً اسکول ٹیچر ہو چکا تھا اور رشید ایاز کالج میں زیرِ تعلیم تھا۔ جمیل محسن کے والد عبدالرحمٰن آزاد خانپور کے مشہور

شاعر تھے،اس کے دادا محسن بریلوی بھی اپنے زمانے میں ریختی، قصیدے اور مثنویاں لکھ چکے تھے والد کی وفات کے بعد جمیل محسن نے والد کے کلام پر ہاتھ صاف کرنا شروع کر دیا۔ رشید ایاز اس کا گہرا دوست تھا اس لئے اسے غزل مہیا کرنا بھی جمیل کا فرض تھا۔ ایک دفعہ دونوں نے آزاد صاحب کی بیاض سے اپنی پسند کی غزلیں نکالیں۔ مقطع میں اپنے اپنے تخلص فٹ کئے اور مشاعرے کے لئے روانہ ہوگئے۔ رستے میں کہیں رشید ایاز کو خیال آیا کہ جمیل کی غزل زیادہ اچھی ہے اس نے ضد کی کہ جمیل اس سے غزل تبدیل کرلے چنانچہ غزلوں کا تبادلہ ہوگیا اور مشاعرہ میں یہ تماشا ہوا کہ جمیل محسن اپنی غزل کا مقطع ایاز تخلص کے ساتھ سنا گیا اور رشید ایاز اپنی غزل کا مقطع ''جمیل'' تخلص کے ساتھ پیش کرگیا۔ ایک اور مشاعرہ میں جمیل نے غزل کا مطلع ہی 'عرض' کیا تھا کہ حاضرین میں سے ایک صاحب نے کہا کہ اس غزل کے اگلے دو شعر میں سناتا ہوں۔ ان صاحب سے دو شعر سن لینے کے باوجود جمیل محسن نے پورے اعتماد کے ساتھ غزل سنائی۔ غزل کے اختتام پر اسی معترض نے کھڑے ہوکر اعلان کیا کہ یہ غزل تو آزاد صاحب مرحوم کی ہے۔ اس پر جمیل نے بڑی جرأت سے کہا کہ میں اپنے باپ کا جائز وارث ہوں اور پھر وہاں سے کھسک گیا۔ کچھ میرے سمجھانے بجھانے پر اور کچھ ''انجمن انسدادِ شعراء خانپور'' کی تگ و دو کے نتیجہ میں آخر کار جمیل نے شاعر کی حیثیت سے دستبردار ہونے کا اعلان کر دیا۔ شاعر بننے کے شوق سے قطع نظر جمیل محسن ذاتی طور پر ایک بہت اچھا دوست تھا۔ اس میں صرف ایک خرابی تھی کہ مسلسل ملتا رہتا اور پھر یکا یک لمبے وقفے کے ساتھ غائب ہوجاتا۔ وقفے کے بعد پھر ملتا تو سارے دنوں کی غیر حاضری کی کسر نکال دیتا۔ جمیل کے ذریعے مجھے کئی انٹ شنٹ قسم کے لوگوں سے ملنا پڑا لیکن اس کے ذریعے بزم فرید اور سعید شباب سے تعارف میری زندگی کے اہم موڑ ثابت ہوئے۔

امیر بخش حاذق مستری کا کام کرتے تھے۔ نفیس شخصیت کے مالک، انہیں دیکھ کر مغل شہزادوں کا حلیہ ذہن میں آتا۔ شخصیت میں ایسی نفاست جو نسوانیت کی حدوں کو ہلکا سا چھو رہی ہو۔ بزم کے سرائیکی شعراء میں حاذق میرے سب سے زیادہ قریبی دوست تھے۔ بزم میں جب بھی

کوئی اختلاف ہوا، حاذق نے ہمیشہ میرے موقف کی حمایت کی۔ سرائیکی میں کافی اور غزل کہتے تھے۔ شعر کہنے کا سلیقہ تھا۔ بزم کے بعد بھی میری ان سے دوستی قائم رہی۔۔ عبدالرحیم خوشدل اور عبدالرشید گاہلہ گزارے لائق شاعر تھے۔ بابا علی بخش سیف فریدی پہلے کریانے کی چھوٹی سی دوکان چلاتے تھے۔ ان کی دوکان ہمارے باباجی کی دوکان سے ملحق تھی۔ جب ہم ابھی رحیم یار خاں میں رہتے تھے، بچپن کا زمانہ تھا، تب باباجی سے ملنے کے لئے خانپور آتے تو مجھے اچھی طرح یاد ہے میں بابا سیف فریدی کی دوکان سے ڈرکو، چنے اور مکھانے وغیرہ خرید کر کھایا کرتا تھا۔ بزم فرید کے زمانے تک بابا سیف نے مستری کا کام شروع کر دیا تھا۔ بس بے چارے گزارہ کرتے تھے۔ ان کے بارے میں ایک روایت بزم کے دوستوں سے سننے میں آئی۔ آپ دیوار تعمیر کرتے تو دائیں بائیں ٹانگیں لٹکا کر، دیوار پر بیٹھ کر اُساری کرتے۔ ساتھ ساتھ پیچھے سرکتے جاتے۔ دیوار آدھی سے زیادہ بن چکی تھی۔ مزدوری کا وقت ختم ہوا تو بابا سیف نے دیوار پر بیٹھے بیٹھے دیہاڑی وصول کی پھر نیچے چھلانگ لگائی۔ بابا سیف مشرقی جانب زمین پر اترے تو دیوار اسی وقت مغربی جانب زمیں بوس ہوگئی۔ مالک مکان نے کہا مستری جی یہ کیا ہوا؟ بابا سیف نے کہا اللہ کی مرضی! انسان بھی مرجاتے ہیں یہ تو پھر دیوار ہے۔ لیکن رفتہ رفتہ بابا سیف اپنے کام میں تجربہ کار ہوتے گئے۔ ان کی شاعری داخلی سے زیادہ خارجی موسیقی سے لبریز ہوتی تھی۔ کلام سنانے سے پہلے اس کی دھن بتاتے مثلاً یہ کلام بطرز ''اک پردیسی میرا دل لے گیا'' پیش ہے۔ اور پھر اسی گیت کی طرز پر اپنا کلام پیش کرتے۔ افسوس کہ بابا سیف وفات پا چکے ہیں۔ رئیس گل دل میں شعر کہنے کی عمدہ صلاحیت تھی۔ میری خواہش تھی کہ وہ ادبی جرائد کا مطالعہ کرے تاکہ شاعری کی تازہ صورتحال سے باخبر ہوسکے لیکن پتہ نہیں کیوں وہ نئے ادب کی بات سننا بھی پسند نہ کرتا تھا۔ افسو س کہ اس جوان رعنا کو اس کے بے رحم سسر نے قتل کر دیا۔

بزم فرید کے روحِ رواں ملک غلام رسول سندر تھے۔ آپ سرائیکی کے بہت اچھے شاعر تھے۔ صدر ایوب کے زمانے میں بی ڈی ممبر کا الیکشن جیتے تو محلے میں ممبر صاحب کے نام سے مشہور ہوگئے۔ غالباً بچپن میں انہیں پیار سے لالو کہتے تھے۔ چنانچہ ان کے بے تکلف دوست انہیں

لالوقصاب بھی کہتے ۔ پہلوانی کا شوق بھی پورا کرتے رہے۔ ایک بار آپ نے پنسار کی دوکان کھول لی۔ ایک بار دیکھا تو ان کی دوکان پر ڈاکٹر ملک غلام رسول سندر کا بہت بڑا بورڈ لگا ہوا تھا۔ پنساری سے ڈاکٹری تک کے سفر پر حیرت ہوئی۔ بھید کھلا کہ ملک صاحب نے ''گھر بیٹھے ڈاکٹر بنئے'' والوں کا ہومیو پیتھک کورس کر کے یہ ڈاکٹری شرع کی ہے۔ ڈاکٹری شروع کئے چند دن گزرے تھے، محلے کا ایک مریض آیا۔ ملک صاحب نے احوال پوچھ کر کوئی مرکب پڑیا بنا دی اور مریض کو ہدایت کی کہ گھر جا کر یہ پڑیا کھا لینا۔ مریض نے کہا کہ گھر کی کیا ضرورت ہے یہیں کھا لیتا ہوں۔ یہ کہہ کر وہ پڑیا کھولنے لگا۔ ملک صاحب نے اصرار کیا کہ پڑیا گھر جا کر ہی کھانا۔ لیکن مریض پڑیا کھول چکا تھا، اس نے اللہ کا نام لیا اور پڑیا پھانک لی۔ یکا یک نجانے کیا ہوا۔ مریض پہلے تو جھومنے لگا اور پھر لہرا کر زمین پر آ رہا۔ مریض بے ہوش ہو چکا تھا اور ملک صاحب اس کے پیروں کے تلوے مل رہے تھے۔ جب مریض نے ہلکی سی ڈکار لی تو ملک صاحب قریبی ہوٹل کی طرف بھاگے۔ وہاں سے آدھ کلو گرم دودھ پیالے میں لیا اور آ کر مریض کو پلانے لگے۔ مریض نے دودھ پی کر کپڑے جھاڑے اور لڑکھڑاتے ہوئے گھر کی راہ لی۔ غالباً اس کے بعد ملک صاحب نے حساب کیا ہوگا کہ اس ڈاکٹری میں آمدن تو ہے ہی نہیں بس خرچ ہی خرچ ہے۔ چنانچہ چند دن بعد جب جیٹھ بھٹہ بازار سے گزر ہوا تو دیکھا کہ ڈاکٹری والا بورڈ اتر چکا ہے اور ملک صاحب نے کبوتر خانہ کھول لیا ہے۔

یہ سارے دوست میری کلاس سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کا یہی بڑا کریڈٹ تھا کہ واجبی سی تعلیم ہونے کے باوجود ادب سے مخلصانہ طور پر وابستہ تھے۔ ان میں جتنی ادبی صلاحیت تھی اسے بروئے کار لائے اور اپنی استطاعت سے بڑھ کر بزمِ فرید کی خدمت کی۔ ملک غلام رسول سندر کی دوکان ہی بزم کا دفتر تھا۔ بزم کی محفلیں اپنے عروج پر تھیں جب ملک صاحب کی دوکان کے سامنے ایک لڑکے خلیل قیصر نے دوکان کھولی۔ یہ لڑکا ایک دن بزم فرید کے اجلاس میں چلا آیا اور کہنے لگا میں بھی شاعر ہوں۔ امیر بخش حاذق نے پوچھا اگر آپ شاعر ہیں تو آپ کا تخلص کیا ہے؟ خلیل قیصر نے فکرمندی سے کہا تخلص تو ابھی نہیں سوچا۔ ملک صاحب کہنے لگے آپ فکر نہ

کریں ہم خود تخلص تجویز کئے لیتے ہیں۔ پھر ملک صاحب، حاذق اور جمیل محسن نے مل کر اس کا تخلص چاند تجویز کیا چونکہ خلیل قیصر کی رنگت گہری سیاہ تھی اس لئے دوستوں نے تو مذاق کیا تھا لیکن خلیل قیصر سچ مچ چاند بن گیا۔ اب سنا ہے اس نے چاند تخلص ترک کر دیا ہے۔ اے کے ماجد چھٹی جماعت سے میرا کلاس فیلو تھا۔ جب بھی خانپور کی ادبی فضا میں مجھے بالکل تنہا کر دینے کی سازش کی گئی تب اے کے ماجد لازماً میرے ساتھ ہوا۔ خانپور کی ادبی دنیا میں پاؤں جمانے کے لئے اے کے ماجد اور جمیل محسن نے میری خاصی مدد کی۔ سعید شباب کی دوستی ایک الگ مضمون کی متقاضی ہے۔ ایک اور دوست ارشد خالد قدرے تاخیر سے ملا۔ اس نے خانپور سے رسالہ عکاس جاری کیا۔ یہ رسالہ اردو اور سرائیکی دونوں زبانوں میں ادبی تحریریں چھاپتا تھا۔ رسالے کا مواد معیاری اور ہنگامہ خیز ہوتا تھا۔ یہ پرچہ تھوڑے عرصہ کے لئے نکلا لیکن خانپور کی ادبی فضا پر اس کا گہرا نقش ابھی تک موجود ہوگا۔ ارشد خالد دیہاتی مزاج کا یار باش آدمی تھا۔ بینک آفیسر ہونے کے باوجود اس کی شخصیت میں سادگی تھی سنا ہے ہمارا یار مزید ترقی کر گیا ہے۔

بزم فرید کی سرگرمیوں کے اثرات ایسے تھے کہ جو شعراء سماجی لحاظ سے ''معزز'' ہونے کے باعث بزمِ فرید کے غریب شاعروں کو ساتھ بٹھانا پسند نہیں کرتے تھے پھر بزم فرید کی تقریبات میں شرکت کے لئے خود چل کر آنے لگے۔ ان شعراء میں پروفیسر نردوش ترابی، آسی خانپوری، رانا پٹیالوی اور حفیظ شاہد خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ حفیظ شاہد سے مسلسل ملاقاتیں ہوئیں تو پتہ چلا کہ ان کا مزاج اپنے حلقۂ احباب سے یکسر مختلف ہے۔ پُرخلوص، بے لوث، محبتی اور دوستی نبھانے والے۔ ''معزز شعراء'' کی انجمن میں ان کی شمولیت کا اصل سبب صرف آسی خانپوری اور نردوش ترابی سے دوستی نبھانا تھا، یہ الگ بات کہ خود ان دوستوں نے بعد میں حفیظ شاہد کی بے لوث دوستی کی ناقدری کی۔ جب میرے خلاف بے جا طور پر ''متحدہ محاذ'' بنایا گیا تب حفیظ شاہد نے دوستی اور اصول ساتھ ساتھ نبھائے۔ دوستی نبھانے کے لئے وہ دوستوں کے کیمپ میں شامل رہے لیکن اس کیمپ میں میرے حق میں ہمیشہ آواز بلند کرتے رہے۔ دراصل انہوں نے اصل شرارتی کو جان لیا تھا۔ اپنے دوستوں کو بار بار سمجھاتے کہ اس شرارتی کی سازش کا شکار نہ بنو۔ بائیکاٹ کر کے کسی

ادیب کی صلاحیتوں کوختم نہیں کیا جاسکتا۔انہیں دنوں میں جب بھی میں نے کوئی چھوٹا موٹا فنکشن ترتیب دیا حفیظ شاہد نے اس میں ضرور شرکت کی۔شرکت سے پہلے اپنے دوستوں کو بتا کرآتے کہ میں حیدر کے فنکشن میں شرکت کرنے جارہا ہوں۔

آسی خانپوری اردواور پنجابی کے خوبصورت شاعر ہیں۔ایڈووکیٹ بھی اور زمیندار بھی۔زودرنج بہت تھے۔ذرا ذرا سی بات پر ناراض ہونے لگتے۔انہوں نے پہلے نردوش ترابی کے مشوروں پر عمل کیا پھر صفدر صدیق رضی پر انحصار کیا۔نتیجہ صاف ظاہر ہے۔اگر انہوں نے حفیظ شاہد کے طرز زندگی سے استفادہ کیا ہوتا تو شاید اب بہتر پوزیشن میں ہوتے۔

خورشید احمد ٹمی ڈائجسٹوں میں کہانیاں لکھتے ہیں۔میں نے ان کی صلاحیتوں کو دیکھتے ہوئے انہیں ادب کی طرف راغب کیا۔ٹمی نے ادبی دنیا کے طور طریقے دیکھے، سمجھے اور پہلا حملہ مجھی پر کردیا(تفصیل لکھتے ہوئے خود مجھے شرم آتی ہے) پھر کوئی بھی ان کی زد سے نہ بچا۔اپنے والد کو بھی ٹمی نے نہیں بخشا،ٹمی میں اچھا افسانہ نگار بننے کی صلاحیت تھی لیکن اپنے بعض نفسیاتی مسائل کے باعث ٹمی کی صلاحیتوں کا زیاں ہوا۔اُس زمانے میں مجھے بھی غصہ جلد آجاتا تھا اگر میں اُس زمانے میں حفیظ شاہد جیسے مزاج کا مالک ہوتا تو شاید ٹمی کی زیادتیوں کو نظرانداز کرکے اس کے ساتھ ایسا سلوک کرتا جس سے اس کی اندرونی اذیتوں کا ازالہ ہوتا اور وہ ایک اچھا افسانہ نگار بن پاتا۔اس کے باوجود ٹمی نے بلاشبہ اپنی استطاعت کے مطابق کئی اچھے افسانے لکھے۔

صفدر صدیق رضی سے جب دوستی ہوئی تو چند دنوں میں ہی برسوں کے یارانے جیسی کیفیت ہوگئی۔رضی کی ایک غزل چھپی اس کا ایک شعر تھا:

لذتیں دفن کر گیا کوئی
روح میں جسم کی دراڑوں سے

میں نے جب’’جسم کی دراڑوں‘‘ کی نشاندہی کی تو رضی نے زوردار قہقہے کے ساتھ کہا’’مارے گئے‘‘۔

میں نے فوراً کہا مارے نہیں گئے،پکڑے گئے۔

اس سے ہماری بے تکلفی کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔آسی خانپوری اور نردوش ترابی کی مجھ سے ناراضگی کی اصل وجہ یہ تھی کہ میں ان سے زیادہ رضی کا دوست ہوں لیکن افسوس رضی نے ایک حقیر سے مفاد کی خاطر نہ صرف دوستی ختم کی بلکہ ایسا انداز اختیار کیا کہ میں حیران رہ گیا۔میرے خلاف جو کچھ کیا گیا اور جس طرح کیا گیا اس کے لئے ایک الگ مضمون درکار ہے۔رضی سے دوستی گہری تھی شاید اسی لئے اس کے غلط طرز عمل پر شدید دکھ کے باوجود ابھی بھی دل میں کہیں اس کی محبت کی لہر محسوس ہوتی ہے۔

اظہر ادیب اچھے شاعر ہیں۔ادب کے دھارے سے کٹے ہوئے تھے۔میں نے انہیں ادبی جرائد سے متعارف کرایا۔ان کے ساتھ مل کر ایک کتاب’’کرنیں‘‘ مرتب کی ایک عرصہ تک ان سے پیار محبت کا سلسلہ رہا۔ہمارے بیشتر دکھ مشترک تھے اس بنا پر ہماری دوستی زندگی بھر قائم رہنا چاہئے تھی ہماری دوستی کسی ناراضی کے باعث ٹوٹی بھی نہیں لیکن قائم بھی نہیں رہی۔مجھے ابھی تک پتہ نہیں چل سکا کہ ہمارے درمیان خلا کیسے پیدا ہوا اور پھر اس خلا میں اتنا سناٹا کہاں سے آگیا؟ رضی کی شدید ترین مخالفت کے زمانے میں اظہر ادیب کی میرے لئے محبتیں اب بھی میری یادوں میں تروتازہ ہیں۔

ظفر اقبال ماچھے بنک آفیسر تھے۔ادیب نہیں تھے لیکن ادبی دنیا کے حالات سے خاصے باخبر رہتے تھے۔جنرل ضیاء کے مارشل لاء کے زمانے میں ہی مواد جمع کرتے رہے تھے اوران کی ہلاکت کے ساتھ ہی انہوں نے مارشل لاء اور عدلیہ کے تعلق سے ایک کتاب لکھ لی تھی۔مکتبہ دانیال کراچی سے ان کا تحریری معاہدہ بھی ہوگیا تھا۔ شاید کتاب اب تک چھپ چکی ہو☆ خانپور کے ادبی ہنگاموں میں شامل نہیں تھے لیکن پورے ادبی منظرنامہ کے بارے میں ایک نپی تلی رائے رکھتے تھے۔ان کا کہنا تھا کہ ان کی رائے غیر جانبدارانہ ہے جبکہ میرا خیال تھا کہ وہ مجھے تقویت پہنچا رہے ہیں۔معتدل لبرل تھے۔ادب اور سیاست میں معتدل لبرل ازم کے قائل تھے۔انتہا پسندوں سے بیزار تھے خواہ وہ کسی کیمپ کے ہوں۔

محمد اکبر بابر ایڈووکیٹ ادب کا اچھا ذوق رکھتے تھے۔’’جدید ادب‘‘ کے لئے انہوں نے

متعدد اشتہارات کے حصول میں مدددی، خانپور کے کامیاب وکلاء میں شمار ہوتے تھے۔ کھلی ڈلی گفتگو کرتے۔ ترقی پسندوں میں صرف فیض احمد فیض اور ظہور نظر کو پسند کرتے تھے۔ ادب اور سیاست کے ساتھ فلسفے میں بھی دلچسپی رکھتے تھے۔ ہیگل کی جدلیات اور مغربی فلسفۂ وجودیت سے میری پہلی شناسائی اکبر بابر کے ذریعے ہوئی۔ اکبر بابر کے مزاج میں اکبر بادشاہ کا جلال اور شہنشاہ بابر کا جمال دونوں شامل تھے اسی لئے کسی اور کے جلال و جمال کو اہمیت ہی نہیں دیتے تھے۔

خانپور میں شعری ذوق رکھنے والے چند نوجوانوں نے تک بند شاعروں کی حوصلہ شکنی کے لئے ایک ''انجمن انسدادشعراء'' قائم کی۔ اس کارِ خیر میں شیخ فیاض الدین، سلطان خاں، رب نواز قریشی اور خواجہ ادریس پیش پیش تھے۔ ان کا طریقہ واردات بڑا دلچسپ ہوتا تھا۔ کسی شاعر کو بلا کر اچھی طرح کھلاتے پلاتے، پھر دروازے بند کر کے شاعر کا کلام سننے پر تل جاتے۔ کلام سن سن کر شاعر کو زچ کر دیتے۔ ٹمی پہلے شاعری بھی کرتا تھا اسی انجمن نے اسے شاعری سے تائب کرایا۔ اچھے شعر پر اچھی داد اور برے شعر پر بری داد دیتے۔ کسی مشاعرے کا انہیں پتہ چل جائے، بن بلائے جا پہنچتے اور مشاعرے کو چار چاند لگا دیتے۔ میں خود تو اس تقریب میں شامل نہیں تھا لیکن باوثوق ذرائع سے معلوم ہوا تھا کہ بلدیہ خانپور کے ایک مشاعرے میں باہر سے کوئی پختون شاعر بھی آئے تھے۔ انجمن انسدادشعراء کے اراکین کی ہوٹنگ کا جب انہوں نے کوئی نوٹس نہیں لیا تو انجمن کے صدر نے کھڑے ہو کر ہاتھ باندھ لئے کہ حضور! اب بس کریں۔ شاعر صاحب پختون تھے، موصوف نے اسی وقت ریوالور نکال لیا۔ ریوالور کے زور پر کلام سنایا اور بعد میں انجمن کے صدر کو شوٹ کرنے پر تل گئے۔ بڑی مشکل سے، منت سماجت کر کے انہیں ٹھنڈا کیا گیا اور پھر دونوں کی صلح کرائی گئی۔ اس بدمزگی کے بعد انجمن انسدادشعراء کی سرگرمیاں ماند پڑ گئیں۔ بہر حال یہ زندہ دل لوگوں کی بے قاعدہ مگر دلچسپ انجمن تھی۔

☆☆☆

☆ خوشی کی بات ہے کہ یہ کتاب ''آئین سے انحراف'' کے نام سے چھپ گئی ہے۔

چند ادیبوں کے تاثرات

ولایتی زبانوں میں ایسے سکیچ اپنے اپنے انداز میں بہت ملتے ہیں لیکن اردو میں ''میری محبتیں'' اپنی نوعیت کی واحد کتاب ہے۔ **اشفاق احمد** (لاہور)

....

حیدر قریشی کا ذہن زرخیز ہے اور منہ کھٹی میٹھی باتوں سے لبریز۔ حیدر قریشی چونکہ پورا منہ کھول کر جی جان سے بات کرتا ہے اس لئے اس کی تحریر برجستہ اور غیر مبہم ہوتی ہے اور قاری اس میں شامل ہو کر محسوس کرنے لگتا ہے کہ اس کے خاکے میں ممدوح اسی کی جان پہچان والوں میں سے ہے اور یوں وہ مطالعہ کو بے تامل اپنی مرضی اور خواہش سے گھٹاتے بڑھاتے گویا اس کے بارے میں پڑھ نہیں رہا ہوتا بلکہ اپنے معمول کے دوران اس سے عین مین مل کر اپنے نتائج اخذ کر رہا ہوتا ہے۔ حیدر قریشی کی اس خوبی نے اس کے خاکوں کو واقعی بہت جاندار اور قابلِ مطالعہ بنا دیا ہے۔ حیدر قریشی کی اس کتاب کے بیس خاکے دو حصوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ پہلے دس کے لئے تو وہ اپنے گھر کی چار دیواری میں ہی تاکا کیا ہے اور باقی دس کے لئے گھر سے باہر نکل آیا ہے۔ اوّل خویش، بعد درویش۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ گھر والوں کے تو کلوز اپ تیار ہو گئے ہیں اور درویشوں کے پروفائل، اور ہر دو پر سے نظر ہٹانے کو جی نہیں چاہتا۔ آج کے مشینی دور کی مصروفیت میں سچ مچ کی ملاقاتوں کی گنجائش خطرناک حد تک سکڑتی جا رہی ہے۔ ان حالات میں یہ بھی غنیمت ہے کہ اوروں کے خاکے پڑھ پڑھ کر ہی ہماری ان سے ملنے کی چاہ پوری ہوتی رہے۔ یوں نہیں تو یونہی سہی، جیسے بھی انسان اپنے آپ کو ''انسانیا'' لے۔ مجھے یقین ہے کہ حیدر قریشی کی محبتوں کی یہ کتاب بہت دلچسپی سے پڑھی جائے گی! **جوگندر پال** (دہلی)

....

''میری محبتیں'' کے ابتدائی پانچ چھ مضامین میں نے پوری طرح پڑھے 'بقیہ کو سرسری دیکھا۔ دوسرے حصہ میں پہلے چار خاکے نیز آخری مضمون پرانے ادبی دوست پڑھا۔ خوب لکھتے

ہیں،آپ نے اپنے بزرگوں کے محیرالعقول واقعات لکھے ہیں'ان سے میں متاثر ہوا۔تمام مضامین بہت دلچسپ اور دلکش ہیں۔ **ڈاکٹر گیان چند جین** (امریکہ)

....

حیدرقریشی نے اپنی والدہ،دادا،والد،بیوی،بہن اور بچوں کو انسانی زاویے سے دیکھا اور ان کی صرف انسانی خوبیوں کا تذکرہ کیا لیکن یہ تذکرہ اتنا دلچسپ ہے کہ یہ سب کردار حقیقی معاشرے کی غیر معمولی شخصیات نظر آتی ہیں۔''برگد کا پیڑ'' ''اجلے دل والا'' ''زندگی کا تسلسل'' ''پسلی کی ٹیڑھ'' بے حد معنی خیز خاکے ہیں اور ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ زمانہ جن لوگوں کو معمولی سمجھ کر نظر انداز کر رہا ہے وہ حقیقی معنوں میں عظیم تھے۔ان کی عظمت اشتہاری نہیں تھی۔

ڈاکٹر انور سدید (لاہور)

....

حیدرقریشی شاعر،افسانہ نگار اور انشائیہ نگار بھی ہیں اور ان کی یہ تینوں خصوصیات ان خاکوں میں جمع ہوگئی ہیں۔ان میں جا بجا بہت سے چھوٹے چھوٹے خوبصورت اور خیال انگیز افسانے بھی مل جاتے ہیں۔۔ایک شاعر کی حیثیت سے انہوں نے کثرت سے شعروں کا موزوں اور برمحل استعمال کیا ہے اور ہر خاکے یا مضمون کے آغاز میں ان کا اپنا ایک شعر درج ہے۔۔ایک انشائیہ نگار کے طور پر ان کے خاکوں میں بہت سے انشائی ٹکڑے موجود ہیں۔بلکہ یہ خاکے ان کے شوخ اور شگفتہ جملوں سے ہی دلچسپ بنے ہیں۔۔حیدرقریشی نے خاکہ نگاری کے فن کو محض شوخی،شگفتگی اور تعارف وتبصرہ تک محدود نہیں رکھا۔ان میں نہایت سنجیدہ معاملات اور دانشورانہ نکتے بھی پیدا کئے ہیں۔ان سب خصوصیات کی روشنی میں میری محبتیں'' خاکوں کا ایک بہت ہی خوبصورت اور خیال انگیز مجموعہ اور خاکہ نگاری کے فن میں ایک اہم اضافہ ہے۔**منشا یاد** (اسلام آباد)

....

معاصر اردو ادب کی بہت سی شخصیات اپنی داخلیت زدگی کی وجہ سے اپنے عہد کے تجربہ کردہ انسانوں کے مسائل کو گرفت میں لانے سے قاصر رہی ہیں۔حیدرقریشی نے اپنی نثری اور شعری تخلیقات میں ذات اور سماج کے معاملات کو یکجا کرنے کے لئے جدید اسالیبی تنوع سے بھرپور کام

لیا ہے۔ان کا ادبی کام باسی کڑھی میں ابال کی مثال نہیں ہے۔حیدرقریشی نے جدید اردو نثر کو تازہ کاری کی ایک پُر تاثیر لہر سے آشنا کیا ہے۔ **ڈاکٹر سعادت سعید** (انقرہ،ترکی)

....

آپ کی بھیجی ہوئی ''میری محبتیں'' مجھے مل گئی ہے۔یقیناً یہ کتاب کا کمال ہے کہ اسے پڑھنا شروع کیا تو پڑھتا ہی گیا۔اور اس وقت تک کسی اور طرف توجہ دینے کا ہوش ہی نہ رہا جب تک کہ وہ ختم نہ ہوگئی۔آپ کی ''محبتیں'' پڑھی تو آپ کے قلم اور مشاہدہ کا قائل ہونا پڑا۔

محمود ہاشمی (برمنگھم،انگلینڈ)

....

'میری محبتیں' کئی مرتبہ پڑھ چکی ہوں اور اگر یہی حال رہا تو میں اس کی حافظ ضرور ہو جاؤں گی۔آپ کی تحریر میں بلا کی سادگی اور قاری کو باندھ رکھنے کی طاقت ہے۔درد کی پوشیدہ لہریں دل ودماغ میں اندر تک اتر جاتی ہیں اور قاری اپنے کو قاری نہ سمجھ کر حیدرقریشی بن جاتا ہے،یہ آپ کی تحریر کا کمال ہے۔ **ڈاکٹر رضیہ حامد** (بھوپال)

....

''میری محبتیں'' میری نظر میں اردو خاکہ نگاری میں ہی نہیں مجموعی اردو ادب کی بھی ایک بڑی اہم کتاب ہے۔اس کتاب کا پہلا حصہ اس لیے خاص اہمیت رکھتا ہے کہ اسے حیدر صاحب نے اپنے اہل واقارب کی نذر کیا ہے اور یہ بات اردو ادب میں بہت ہی نادر ہے۔انہوں نے اس حصے کا ''اول خویش'' نام رکھا اور ایسے خوبصورت خاکے نقش کیے جن میں خاکہ نگاری،افسانہ نگاری،سوانح نگاری اور خود نوشت سوانح نگاری کا امتزاج دل نشیں صورت سے ظاہر ہوتا ہے۔ان خاکوں میں ادب مصوری سے قریب تر ہوتا ہے کہ ہم ان خاکوں رپورٹریٹس کو پڑھ کر ایسا محسوس کرنے لگتے ہیں کہ ان کے رشتے داروں کی ایسی صاف صاف تصویریں دیکھ رہے ہیں جن کے نقشے ایک خاص اور معتبر زاویۂ نگاہ نے کھینچ لیے ہیں۔جن میں ان شخصیات کے ساتھ ساتھ حیدر صاحب کے جوہر بھی سامنے آتے ہیں۔یوں ظاہر ہوتا ہے کہ قریشی صاحب نے ''اپنے اندر کی آواز بڑے دھیان سے سن کر'' یہ خاکے تراشے ہیں۔اسی لیے ہر خاکہ ایک معیاری پورٹریٹ کی

طرح دکھائی دیتا ہے۔ دورانِ مطالعہ ہمیشہ مجھے ایسا لگتا ہے کہ وہ اپنے قلم سے نہیں بلکہ اپنے دل سے لکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں بھی دورانِ مطالعہ اس بات کا شدید احساس ہوتا ہے کہ ہم ان خاکوں کے افراد کو پڑھ نہیں رہے بلکہ ان سب سے مل رہے ہیں۔ **ھانی السعید** (مصر)

■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■

''میری محبتیں'' تو کمال کی کتاب ہے سیدھی، سنجیدہ باتیں لکھتے ہوئے آپ جو ہلکا سا مزاحیہ رنگ دے کر جملہ مکمل کرتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے قہوہ پیتے پیتے الائچی کا کوئی دانہ دانت تلے آ کر ذہن و دہن کو خوشبو سے معطر کر جائے۔ **ترنّم ریاض** (دہلی)

■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■

آپ کی کتاب ''میری محبتیں'' دیکھنی شروع کی ہے۔لگتا ہے آپ کے پاس کہنے کو بہت کچھ ہے۔ کہہ سکتے ہیں اور کہنے کا یارا بھی ہے۔ میرا دل چاہا کہ آپ کو بتاؤں کہ جو پڑھا ہے' پسند آیا ۔آپ نے بڑی مشکل باتیں بڑی آسانی سے لکھ دی ہیں' آپ کو اس کی داد ملے گی۔۔۔بڑی بے ساختگی ہے، روانی ہے اور گندھی ہوئی خوشگواریت لاجواب ہے۔۔۔آپ کی نثر میں شاعروں سے اچھی اور زیادہ شعریت ہے۔ **مقصود الٰہی شیخ** (انگلینڈ)

■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■

نرم اسلوب سے جھانکتی ہوئی تصویریں جاذبِ نظر ہی نہیں قابلِ تقلید بھی بن گئی ہیں۔ خاکہ نگاری نہ ہی کارگہ شیشہ گری ہے اور نہ ہی فن بت تراشی یا مصوری اور فوٹو گرافی' بلکہ یہ تو ایک طرح کی کلوننگ ہے۔آپ نے جن ہستیوں کی کلوننگ کی ہے ان میں ہر ہستی اپنے مکمل وجود کے ساتھ اُبھر آئی ہے۔ یہی آپ کے اسلوب اور فن کی بڑی کامیابی ہے۔ **اسلم حنیف** (انڈیا)

■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■

آپ کے خاکے ''میری محبتیں'' ماشاءاللہ زبردست ہیں۔ یہ نہ صرف آپ کی محبت کی غمازی کرتے ہیں بلکہ اس ثقافتی پس منظر اور روایات کو اجاگر کرتے ہیں جن میں آپ کی تربیت اور ذہنی نشو ونما ہوئی ہے۔آپ کے دیکھنے پرکھنے کے انداز کا اچھوتا پن اور یوں ایک مخصوص زاویے سے زندگی کرنے کی دعوت' ان خاکوں کا نمایاں پہلو ہیں۔ اپنی خوشگوار تحریروں سے آپ نے ایسی قدروں

کو بے نقاب کیا ہے جن سے نئی نسل کے جیالے آشنا نہیں ہیں۔

نیاز احمد صوفی (لاہور)

■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■

حیدر قریشی سے غائبانہ تعارف اس دور میں ہوا جب ''بالمشافہ'' تعلق کسی بلائے ناگہانی کو دعوت دینے کا باعث بن سکتا تھا- بلا کوئی اتنی ناگہانی بھی نہیں بلکہ کسی مارنے والے بیل کی طرح ''قابل دید'' بھی تھی- اس تعارف میں حیدر قریشی کی شخصیت کا غالب پہلو اس کی ''مومنانہ شان'' تھی- وہ والی مومنانہ شان جس کا خلاصہ یہ ہے کہ: رزم حق و باطل ہو تو فولاد ہے **مومن**- بعد ازاں متعدد معرکہ آرائیوں کے تذکرے سننے اور پڑھنے کے بعد یہ حسن ظن مزید مستحکم ہوا-

ماردھاڑ سے بھرپور اس منظر نامے سے باطن میں چھپے کسی ''چھوٹے سے مومن بچے'' کی آنکھوں میں تراوت تو ضرور پیدا ہوتی لیکن دل کو اس ''آہنی ہاتھ'' کے پیچھے موجود حلقہء یاراں میں بریشم کی طرح نرم شخصیت کی موجودگی کا یقین بھی رہا اور جستجو بھی- چند ماہ قبل جب ''عمر لا حاصل کا حاصل'' پڑھنے کا موقع ملا تو لطیف تر حسیات رکھنے والے اس منکسر المزاج اور رقیق القلب شخص سے ملاقات ہوئی تو لطف دو آتشہ ہو گیا- آج مدرز ڈے کے حوالے سے حیدر قریشی کی تحریر پڑھ کر مجھے اپنی ماں یاد آ گئی اور ایک ایک لفظ کے ساتھ جہاں حیدر قریشی کی امی جی کو تصور (ویژولائز) کرتا رہا وہیں اپنی امی جی کا چہرہ آنکھوں کے سامنے لا کر اشکبار ہوتا رہا- ماؤں کے سانجھا ہونے کا ایک یہ مفہوم بھی تو ہے۔ **محمد اکرم** (امریکہ)

■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■

خاکوں پر مشتمل آپ کی کتاب **میری محبتیں** مجھے ملی۔ اس عنائت کے لئے آپ کا بہت بہت شکریہ! **روشنی کی بشارت** کے افسانے پڑھنے کے بعد آپ کے ساتھ جو تعارف ہوا تھا' اس کتاب کے مطالعہ کے بعد اس نے ایک اور منزل طے کر لی ہے۔آپ سے شناسائی کی سمت ''میری محبتیں'' ایک دلگداز پھاٹک کی مانند ہے۔

سعید انجم (ناروے)

■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■■